پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب .
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

(ناول)

سلمٰی اعوان

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد، کراچی، لاہور

بصد احترام..............

...........سکویڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی..........

............کے نام..........

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

سلمیٰ اعوان

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

یہ لہو سُرخی ہے آزادی کے افسانے کی

یہ شفق رنگ لہو

جس کے ہر قطرے میں خورشید کئی

جس کی ہر بوند میں اِک صبح نئی

دور جس صبح درخشاں سے اندھیرا ہوگا

رات کٹ جائے گی گلرنگ سویرا ہوگا

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب .
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups
/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

باب نمبر:۱

ایشیائی ملکوں کی گرمائی دوپہریں حدّت کے اعتبار سے دنیا بھر میں منفرد ہیں۔آفتاب کی آتشیں کرنیں کرہ ارض کے اس خطے کو جلا ڈالنے پر اُتر آتی ہیں۔فضاؤں میں بگولے اڑتے ہیں۔گھمبیر اُداسی ہر سُو ٹپکتی ہے اور ماحول پر مسلط سناٹے اس کی ویرانی کو اور بھی گہرا کر دیتے ہیں۔

آگرے کی وہ دوپہر بھی کچھ ایسی ہی گرم اور ویران تھی۔کسی ذی روح کی آواز کانوں سے نہ ٹکراتی تھی۔حد درجہ تپش سے کول تار کی سیاہ سڑکیں پگھل رہی تھیں۔ماحول تمازت میں ڈوبا ہوا تھا۔

مضافاتی علاقے میں واقع سڑک کے کنارے اس کوٹھی پر بھی ہُو کا عالم طاری ہے جس کے باہر مرزا شجاع الدین کے نام کی تختی آویزاں نظر آتی ہے۔بنگلے پر ایک اچٹتی سی نظر ہی مکینوں کی امارت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔آہنی گیٹ کے راستے اندر داخل ہوں اور سرخ بجری بچھی روش عبور کرتے ہوئے برآمدے میں قدم رکھیں تو سکون و طمانیت کا گہرا احساس ملتا ہے۔طویل و عریض برآمدے میں سے گزرتے ہوئے داہنے ہاتھ کی طرف

چوتھے نمبر کے کمرے کا دروازہ کھولیں تو اس گھر کی مالکن خدیجہ بیگم حدیث کی کسی کتاب کے مطالعہ میں محونظر آتی ہیں۔سفید نورانی چہرہ بڑھاپے کی مخصوص سلوٹوں سے پُر ہے۔

بائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے۔اٹھارہ انیس سالہ ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔چہرہ ملاحت لئے ہوئے ہے۔مناسب قامت اور صحت مند جسم پر بیش قیمت لباس ہے۔آنکھیں ہیرے کی طرح جگمگا رہی ہیں۔چہرہ خوشی سے گلرنگ ہے۔یہ خدیجہ بیگم کی صاحبزادی شمیمہ خانم ہے۔

خوشی سے بھرپور آواز میں چلاتی ہے۔

"اماں بی! ڈاکٹر بھائی کا خط۔"

خدیجہ بیگم نے پلٹ کر بیٹی کی طرف دیکھا۔اس کے ہاتھ میں خط کو دیکھتے ہی اُن کا چہرہ خوشی کے باپایاں احساس سے دمک اٹھا۔

"میرے اکرم کا خط آیا ہے۔"

بیتابیٔ شوق سے کھولا اور نگاہیں اُن سطور کا طواف کرنے لگیں جو لختِ جگر کے ہاتھ سے لکھی گئی تھیں۔وہ پڑھتی جا رہی تھیں۔ان کی آنکھوں کے گوشوں اور لبوں پر تبسم کی کرنیں چمک رہی تھیں۔ خط ختم ہوا تو وفورِ محبت سے پیار بھرے بوسے خط پر ثبت ہونے لگے۔شفقت مادری کے گہرے جذبے نے خط کو آنکھوں سے لگا دیا۔پیار کی چاشنی اور محبت کی مہک لیے ہوئے خط کے حروف قلب کے ساتھ ساتھ آنکھوں کو بھی ٹھنڈک پہنچاتے گئے۔وہ نجانے کب تک شوق کی وادی میں گھری رہتیں کہ شمیمہ کی آواز انہیں تصوراتی دنیا سے باہر کھینچ لائی جو مسکراتے ہوئے ماں کی کیفیات دیکھ رہی تھی۔

خط بیٹی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے وہ مسکرائیں۔"پگلا ہے۔"

شمیمہ خط پڑھ چکی تھی۔لیکن تشنگی ابھی باقی تھی۔نظریں خط پر دوبارہ دوڑ رہی تھیں۔

کنگ کالج

لندن

۲۵مئی ۱۸۸۴ء

اچھی و پیاری اماں بی!

خدا آپ کا سایہ عاطفت ہم پر قائم رکھے

تسلیم!

بے اختیار مسکرا دیتا ہوں۔ جب آپ کے خطوط میں مبہم مبہم خدشات اپنے لئے پڑھتا ہوں۔ پریشانیوں کے کس حصار میں گھر گئی ہیں آپ بھی اماں بی! فضول قسم کے اندیشے کیوں آپ پر مسلط ہیں۔ کتنی مرتبہ آپ کو یقین دلاؤں۔ کتنی بار لکھوں کہ دیار مغرب کی یہ سفید فام عورتیں ہم جیسے (بقول ان کے) گنوار ہندوستانیوں کو کم راس آتی ہیں۔ یہ مے تیز ضرور ہے۔ لیکن اس کا نشہ، اس کا خمار، کتنی جلدی ٹوٹ جاتا ہے؟ یہ شاید آپ کو معلوم نہیں۔ مغرب کی یہ متلون مزاج بیٹیاں پل جھپکتے میں جیون کے ناطے یوں توڑ دیتی ہیں کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔

ویسے بھی اماں بی! نیلی آنکھیں اور سنہری بال میری چڑ ہیں۔ ان کے سفید سفید کشش سے عاری چہروں کو میں نے کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ اپنے بیٹے پر یقین رکھیئے۔ وہ کسی دم چھلے کے ساتھ ہندوستان نہیں آئے گا۔

اس یقین دہانی کے ساتھ ساتھ میں اپنی پسند بھی آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ میرے لئے ایسی دلہن منتخب کیجئے جس کی رنگت پیازی، آنکھیں نرگسی، گیسو دراز اور سیاہ ہوں اور رچال میں شہزادیوں جیسا بانکپن ہو۔ امید ہے آپ بہو کا انتخاب کرتے وقت میرے پیش کردہ معیار کو مدنظر رکھیں گی۔

اپنی صحت کا خصوصی خیال رکھیئے۔شمیمہ آج کل آپ کے پاس ہے یا اپنی سسرال میں؟اس کا بچہ کیسا ہے؟ماں بیٹوں کو میرا پیار۔ابا میاں کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجئے۔

اماں بی ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں ۔خط ابا میاں کو نہ دکھایئے ۔ورنہ وہ اپنے مخصوص لہجے میں فرمائیں گے۔

''ہوں اپنی صورت کبھی آئینے میں میں کا ہے کو دیکھی ہوگی۔''

فقط

آپ کا تابعدار بیٹا ۔اکرم۔''

مسکراتے ہوئے شمیمہ نے ماں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''بیٹے کے لئے جنت ارضی کی یہ حور کہاں سے ڈھونڈیں گی اماں بی۔''

''خدا کی تخلیق کی ہوئی دنیا بہت وسیع ہے شمیمہ! میں یقیناً ایسی ہی بہو لاؤں گی جو میرے بیٹے کے معیار پر پوری اترے۔جو میرے اس گھر میں روشنی ہی روشنی اور نور ہی نور بکھیرے''

خدیجہ بیگم نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے بیٹی پر گہری نگاہ ڈالی۔

''نظریں کس پھول کے دامن سے الجھی ہیں۔مجھے نہیں بتائیں گی۔''؟شمیمہ نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے ماں کے گھٹنے بازوؤں میں سمیٹ لیے۔

''حامد علی بیگ کی دختر نیک اختر ؟''انہوں نے پر سکون انداز میں کہہ کر بیٹی کو دیکھا۔

شمیمہ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

''میں کہاں بھٹک رہی تھی واقعی ۔اماں بی! آپ کے بلند ذوق کی داد دینی

چاہیئے ۔ثریا تو دُرِ نایاب ہے ۔''

''لیکن وہ لوگ کچھ پس و پیش نہ کریں ۔''موہوم سے اندیشے نے سر اٹھایا اور اس کا خوشی سے کھلا چہرہ سنجیدہ ہوگیا ۔

''میرا خیال تو نہیں کہ وہ لوگ ہمیں مایوس کریں ۔بہر حال قسمت آزما دیکھتے ہیں ۔''

مرزا شجاع الدین کا سلسلہ نسبت براہ راست واجد علی شاہ سے جا ملتا تھا۔مغلیہ سلطنت کا ستارہ جب اوج کمال پر پہنچ کر پستیوں میں ڈوب گیا ۔سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ایک عیار اور چالاک قوم ملک پر قابض ہوگئی ۔شاہی خاندان کے بیشتر شہزادوں اور شہزادیوں کو جلاوطن کردیا گیا بے شمار موت کے گھاٹ اُتر گئے ۔تو مرزا شجاع الدین کی خوش قسمتی ہی تھی کہ ان کا مقدر انگریز کے عتاب کا نشانہ نہ بن سکا بخت زور آور تھا۔سیاست سے انہوں نے بالکل کنارہ کشی اختیار کئے رکھی ۔جائیداد کافی وسیع تھی ۔لیکن ان کی زندگی سادگی کی ایک روشن مثال تھی ۔ان کے ہاں خوشامد پسندوں کا کبھی ہجوم نظر نہیں آتا تھا۔لنگر جاری نہیں تھے انہوں نے انتہائی سمجھداری اور ذہانت سے کام لیا۔اور ان مغل نوابوں کی طرح مقروض نہیں ہوئے جو ابھی تک اپنی فضول روایات کو سینوں سے چمٹائے بیٹھے تھے ۔

اولاد بھی خدا نے مختصر دی تھی ۔ایک لڑکا اور ایک لڑکی لڑکا اکرم بمبئی میڈیکل کالج سے ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن گیا ہوا تھا ۔

شمیمہ کو عربی ۔فارسی ۔اور انگریزی کی معقول تعلیم دلا کر اس کی شادی کردی گئی تھی اور وہ اس وقت ایک گول مٹول ،خوبصورت بچے کی ماں بن چکی تھی ۔

خدیجہ بیگم چونکہ لوگوں سے سنتی رہتی تھیں کہ فلاں ولائیت گیا اور وہاں سے تنہا نہیں لوٹا ۔اسی لئے اکثر اکرم کی طرف سے پریشان رہتیں ۔اگر چہ انہیں بیٹے پر پورا پورا

اعتماد تھا۔لیکن پھر بھی حالات سے خائف تھیں ۔کبھی کبھار خطوط میں اپنے خدشات کا اظہار بھی کر دیتیں۔اکرم کا خط پڑھ کرانہیں دلی سکون محسوس ہوا تھا۔وہ پریشان کن خیالات جو اکثرو بیشتر دماغ میں رینگتے رہتے اب بالکل ختم ہو چکے تھے۔

انہوں نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں ۔تصور اڑا۔کتنے ہی حسین منظر نگاہوں کے سامنے آتے چلے گئے۔بیٹے کی آمد،اس کی شادی اور گھر میں کلکاریاں مارتے ننھے منے بچے۔اس سے ان کے چہرے پر جیسے ممتا کا نور برس رہا تھا۔

باب نمبر:۲:

گہرے آسمانی رنگ کی ایک خوبصورت کار کشادہ سڑک کے سینے پر تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی ۔کار میں پردے کا خصوصی اہتمام تھا۔ونڈ سکرین کو چھوڑتے ہوئے بقیہ تمام شیشے آسمانی ساٹن سے ڈھکے ہوئے تھے۔کار میں موجود خواتین برقعوں میں لپٹی بیٹھی تھیں ۔ڈرائیور کے ساتھ خادمہ غفورن اور پچھلی سیٹ پر خدیجہ اور ان کی صاحبزادی شمیمہ خانم تھیں ۔ان کی منزل الہ آباد تھی ۔

لہلہاتے ہرے بھرے کھیتوں کے سلسلے سڑک کے کنارے کنارے دور تک چلے گئے تھے۔درختوں کا لامتناہی سلسلہ ختم ہونے کو تھا۔کار شہر کی حدود میں داخل ہو رہی تھی کتنے ہی پیچ و خم آئے۔کتنے ہی موڑ کاٹے اور اب ان کے سامنے ایک خوشنما کوٹھی تھی جس کے باہر گیٹ کے ساتھ اعلیٰ شیشے کے چوکھٹوں میں جسٹس حامد علی بیگ کا نام لکھا ہوا تھا۔

پورچ کے قریب جا کر کار رک گئی ۔ڈرائیور نے باہر نکل کر ملازم کو اندر اطلاع دینے کے لئے کہا۔چند لمحے گزرے ہوں گے کہ گھر کی دو خادمائیں بھاگی بھاگی آئیں ۔ڈرائیور نے مودبانہ انداز میں کار کے دروازے کھولے ۔خدیجہ بیگم اور شمیمہ کار سے

اتر کر خادماؤں کے ساتھ چلیں۔راہداری سے گزرتے ہوئے وہ زنان خانے میں داخل ہوئیں یہاں حامد علی کی بیگم صفیہ خاتون چہرے پر دلنشیں مسکراہٹ لئے پذیرائی کے لئے موجود تھیں ۔ان پر نگاہ پڑتے ہی آگے بڑھیں اور خدیجہ کے گلے لگ گئیں ۔خدیجہ بیگم سے اچھی طرح ملنے کے بعد شمیمہ کو گلے لگایا اور پھر دونوں کو ساتھ لئے نشست گاہ میں آگئیں۔دیوان پر خدیجہ بیگم کو بٹھاتے ہوئے کسی قدر رشا کی انداز میں بولیں ۔

آپا جان آپ تو عید کا چاند ہوگئیں ۔

''مت پوچھو صفیہ! یہ بڑھاپا سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے ۔نہ گرمی چین لینے دیتی ہے اور نہ سردی میں سکون میسر آتا ہے ۔اب تو رخت سفر باندھے خدا کے دربار سے بلاوے کے منتظر بیٹھے ہیں۔''

''یوں مت کہئے آپا جان !اللہ آپ کو صحت اور سلامتی عطا کرے۔ابھی تو خاندان کو آپ کی اشد ضرورت ہے ۔''

''صفیہ!۔۔۔۔کارجہاں کبھی کسی کی عدم موجودگی سے متاثر نہیں ہوئے ۔''

صفیہ بیگم جواب دینے ہی والی تھیں کہ نگاہ بچے کی جانب مبذول ہوگئی جسے خادمہ اندر لا رہی تھی۔

''لو اپنی افراتفری میں میں نے شمیمہ کا بچہ بھی نہیں دیکھا ۔ادھر لاؤ میرے پاس ۔''انہوں نے خادمہ سے کہا۔

ہنسوڑا اور خوبصورت بچہ صفیہ بیگم کے پاس آکر اُچھلنے لگا۔

''ماشاءاللہ! ہوبہو اپنے باپ کی تصویر ہے ۔''

''شمیمہ کو آپ کے پاس آئے کتنے دن ہوئے ہیں ۔''انہوں نے خدیجہ بیگم سے پوچھا۔

''تقریباً دو ہفتے ہونے کو ہیں۔''انہوں نے جواب دیا۔

''ہاں میرے سننے میں آیا ہے اسد کی پوسٹنگ ڈیرہ دون ہو گئی ہے۔''

''جی ہاں چچی جان آپ نے ٹھیک سنا ہے۔اگلے ماہ تک ہم لوگ وہاں چلے جائیں گے۔''

''ثریا اور بچے کہاں ہیں؟''خدیجہ بیگم نے پوچھا۔

''ثریا کی دوست پچھلے چند دنوں سے بیمار ہے۔وہ اور فردوس اس کی عیادت کے لئے گئی ہیں۔بس آیا ہی چاہتی ہیں۔زبیر اور عبداللہ ٹیوٹر سے پڑھ رہے ہیں۔''

کافی دیر بعد گفتگو کا سلسلہ سولہ سترہ سالہ فسوں خیز حسن کی مالک ایک لڑکی کے کمرے میں داخل ہونے سے منقطع ہو گیا۔یہ ثریا تھی۔خدیجہ بیگم فوراً اٹھیں اور بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے اس کے چہرے اور گھنے بالوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔اتنے میں تیرہ چودہ سالہ فردوس بھی کمرے میں آ گئی بلاشبہ وہ بھی خاصی خوبصورت تھی۔لیکن ثریا کے مقابلے کی ہرگز نہ تھی۔ویسے بھی حسن اپنی معراج پر پہنچنے کے لئے ابھی تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔وہ بانکپن اور ادائیں اس میں نہ تھیں جو ثریا کے جلووں کو رنگیں بنا رہی تھیں۔

ایک بجے حامد کورٹ سے آئے۔بھاوج کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔کتنی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

ڈیرھ بجے سب لوگوں نے کھانا کھایا۔پھر صفیہ بیگم انہیں آرام کرنے کے لئے دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

رات کے کھانے کے بعد محفل ایک بار پھر جمی اب کمرے میں صرف حامد علی،صفیہ اور خدیجہ بیگم تھیں۔شمیمہ ثریا کے کمرے میں اس سے محوِ گفتگو تھی۔

خاندان،گھرداری اور زمین،جائیداد کے کتنے ہی مسائل زیر بحث آئے۔باتوں

کا سلسلہ جو ایک بار چل نکلے مشکل ہی رکتا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ خدیجہ بیگم گفتگو کے لئے راہ ہموار دیکھ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں حامد علی سے مخاطب ہوئیں۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ایک درخواست لے کر آئی تھی۔ جسے تم شرف قبولیت بخش سکو تو یہ ہمارے خاندان کیلئے بہت عزت افزائی کی بات ہوگی۔ حامد یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ میرا دامن خوشیوں سے بھر کر مجھے رخصت دو یا مجھے بے نیل مراد واپس بھیجو۔ فیصلہ اب تمہیں کرنا ہوگا۔''

''آپا جان اظہار مدعا واضح طور پر کیجئے نا۔'' حامد علی سمجھتے ہوئے بھی تھوڑا سا انجان بنتے ہوئے بولے۔

''میں ثریا کو اپنی بیٹی اور اکرم کو تمہارا بیٹا بنانے کی طلبگار ہوں۔''

یہ سن کر حامد علی خاموش رہے۔

خدیجہ بیگم نے سلسلہ گفتگو جاری رکھا۔

''ہم ایک باپ دادا کی اولاد ہیں۔ ہمارے مابین بیگانگی اور اجنبیت نہیں جو سوچنے اور پرکھنے کی متقضی ہو۔ اکرم تمہارے سامنے پل کر جوان ہوا ہے اور ثریا میرے لئے جانی پہچانی ہے۔ یہ بندھن ہمارے مابین تعلقات کو استحکام بخشنے کا ضامن ہوگا۔''

حامد بیگ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔

''آپا جان آپ کو اتنی جلدی کا ہے کی ہے؟ اکرم کو لندن سے واپس تو آلینے دیجئے۔'' یہ صفیہ بیگم تھیں۔

''پانچ چھ ماہ تک وہ واپس آرہا ہے۔ اس کی آمد کے فوراً بعد میں اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی ہوں۔ میری صحت برابر گر رہی ہے۔ عمر کے اس دور میں زندگی کا کیا اعتبار؟'' خدیجہ بیگم نے بیگ کھولا اور اس میں سے اکرم کا خط نکال کر حامد علی کی طرف بڑھا

دیا۔

دھیمی دھیمی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیلتی جا رہی تھی۔خط سنجیدگی اور مزاح کا گہرا تاثر لئے ہوئے تھا۔

خدیجہ بیگم کا خاندان ان کا اپنا خاندان تھا۔بیٹی کی زندگی اکرم جیسے شائستہ اور قابل لڑکے سے وابستہ کرنے کا خیال خاصا طمانیت بخش تھا۔بااین ہمہ وہ تذبذب میں تھے۔اکرم چار سال سے انگلستان میں تھا۔

لیکن اس کا خط ان کے وسوسوں کو ختم کر چکا تھا۔خط بند کرتے ہوئے وہ خدیجہ بیگم کے طرف دیکھ کر مسکرائے۔

''آپا جان میں آپ سے کوئی بھاگتھوڑا ہی جا رہا ہوں۔''

''نہیں میاں، تمہیں میرا دامن امید اور خوشیوں سے بھرنا ہی ہوگا۔میں واضح طور پر اپنے سوال کا جواب چاہتی ہوں۔''

''آخر آپ اتنی مضطرب کیوں ہیں؟ابھی تو چند روز ہمارے یہاں آپ قیام کریں گی نا؟''

''نہیں حامد علی میں کل واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''اس بار آپ کو اتنی جلدی نہیں جانے دیا جائے گا۔''وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

''مزید رہنے کے بارے میں تو تبھی سوچا جا سکتا ہے۔جب میرے سوال کا جواب اثبات میں ملے گا۔''

''آپ ہماری بزرگ ہیں آپا جان! ۔۔۔۔آپ کو مایوس لوٹانا آپ کی نہیں ہماری توہین ہے۔''

''جیتے رہو حامد علی!۔۔۔تم نے میری لاج رکھ لی۔''ان کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

''آپ اب آرام کریں۔گیارہ بج رہے ہیں۔باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

صفیہ بیگم،خدیجہ بیگم کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر اپنی خوابگاہ میں واپس آئیں تو حامد علی بستر پر دراز سگریٹ کے مرغولے بنا رہے تھے۔وہ ان کے قریب آتے ہوئے بولیں۔

''آپ کو اتنی جلدی رضامندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

انہوں نے ہنستے ہوئے بیوی کی طرف دیکھا اور بولے۔

''تم چاہتی تھیں بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے وہ اس گھر کے دس بار چکر لگائیں۔اور جب چکر لگاتے لگاتے تھک جاتیں تب انہیں مژدہ جانفزا سنایا جاتا۔نہیں بیگم وہ بڑی سادہ او رقدر دان خاتون ہیں۔زندگی میں کبھی انہوں نے تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا۔ریاکاری اور فریب سے انہیں شدید نفرت ہے۔میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ویسے بھی اکرم مجھے بہت پسند ہے۔یہ فیصلہ میں نے سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے۔''

''میرا خیال تھا رسمی طور پر ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ورنہ وہ لوگ تو مجھے بھی بہت پسند ہیں اور میرے میکے میں بھی انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔صفیہ بیگم نے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''میرا فیصلہ عقل و دانش کی روشنی میں ہے۔''انہوں نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے بات ختم کی۔

باب نمبر:۳

کلکتہ سول ہسپتال سے ملحقہ خوبصورت بنگلے کے ایک کمرے میں چونتیس پینتیس سالہ صحت مند ،وجیہہ اور باوقار مرد چھبیس سالہ ایک انتہائی خوبصورت عورت کے شانوں پر ہاتھ رکھے جانے اُسے کیا سنا رہا تھا۔اس کی آنکھوں سے ٹپکتا محبت کا نور عورت کی آنکھوں میں منتقل ہورہا تھا۔وہ اس سحر سے مسحور ہوتی جارہی تھی۔

یہ ڈاکٹر اکرم اور ثریا تھے۔

مقدر قوس وقزح جیسے حسین رنگ لئے ان پر سایہ فگن تھا۔جس کی گھنی چھاؤں تلے ان کا جیون سرمدی گیتوں کی آغوش میں گزر رہا تھا۔

ساون کئی بار گہری سرمئی اور خرام آلود اودی بدلیوں کے ساتھ نیل گگن پر چھایا۔سرما کی یخ اور خنک ہواؤں نے سرسراتے ہوئے سرگوشیوں میں انہیں پیار بھرے گیت سنائے۔

بہاروں نے ان کے لئے رومان انگیز نغموں کی دھنیں فضا میں بکھیریں۔حسین

صبحوں اور سحر آگیں شاموں میں ان کا پیار گہرا ہوتا گیا۔ زندگی ان کے لئے جاذبیت اور رعنائی لئے ہوئے تھی۔

ثریا کے جگمگاتے نین کنول اور بھی حسین ہو گئے تھے۔ ممتا کے لازوال جذبے نے ان نرگسی آنکھوں کی رعنائی کہیں زیادہ بڑھا دی تھی۔

ان کا جیون ہر لحاظ سے مکمل تھا۔

''اللہ بتا دیجئے نا۔ کون سی انوکھی خوشخبری آپ میرے لئے لائے ہیں؟'' وہ ناز سے اٹھلائیں۔

''واہ منہ میٹھا کئے بغیر ہی بتا دوں؟'' ڈاکٹر اکرم اس کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں جھانکے۔

''اوہوں! عاجز کئے دے رہے ہیں آپ تو۔'' بل کھاتے ہوئے بولیں۔

''این اور فریڈرک کل آ رہے ہیں۔''

''سچ؟'' وہ خوشی سے چلائیں۔

''بالکل سچ بھئی سو فی صد سچ۔ بلکہ اگر کہوں تو ہزار فی صد سچ۔''

انہوں نے اس کی حسین آنکھوں کو ہاتھوں سے بند کرتے ہوئے پیار بھری آواز میں کہا۔

''چھوڑیئے۔'' وہ اس کی گرفت سے نکل کر بھاگیں۔

وہ خوش تھیں۔ بے انتہا خوش۔ این ان کی عزیز ترین دوست تھی۔ این سے ان کی ملاقات بھی بڑے انوکھے اور دلچسپ انداز میں ہوئی تھی۔ شادی کے دو سال بعد وہ شوہر کے ساتھ انگلستان کے تفریحی سفر پر گئیں۔ ان کا قیامت خیز حسن برطانیہ کی سرد ہواؤں میں اور بھی شعلے دینے لگا تھا۔ انہوں نے انگلینڈ کے تقریباً سبھی شہروں کو پسند کیا لیکن لندن انہیں

ایک آنکھ نہ بھایا۔

دُھواں دُھواں فضا، بادل ،بارش ،دھند اور عجیب سی گھٹن ۔یہ لندن تھا۔جسے دیکھنے کی وہ حد درجہ شائق تھیں، بے نیاز الجھے الجھے اور لاابالی سے لوگ۔

جب وہ سیر کے لئے نکلتیں اور ان کا حسن اپنی تمام تر حشر سامانیوں سے لندن کی شاہراہوں پر جگمگاتا ۔یوں گمان پڑتا جیسے کسی اندھیری شب میں کوئی جگنو چمک رہا ہو یا ستاروں کے جھرمٹ میں چاند نکل آیا ہو۔تیزی سے چلتے انسان انہیں دیکھ کر پل بھر کے لئے ضرور رکتے ۔حیرانی سے ان کے توبہ شکن حسن کو دیکھتے۔نگاہوں میں داد وتحسین کے جذبات ابھرتے اور دل ہی دل میں قدرت کے اس شاہکار کی داد دیتے آگے بڑھ جاتے ۔

ایسے ہی لوگوں میں سے ایک این بھی تھی ۔جس کی آنکھوں میں تجسس وشوق کی ایک دنیا اُمڈ آئی اور جس کے دل نے بارگاہ حسن میں خراج تحسین پیش کیا۔وہ آگے نہیں بڑھی تھی ۔اس کے تیزی سے اٹھتے قدم مشینی انداز میں رک گئے ۔اور وہ جانے کس جذبے کے تحت کشاں کشاں ان کے قریب چلی آئی۔اس کی آنکھوں میں خلوص کی جوت تھی۔ پیار کی روشنی تھی ۔یہ جاننے پر کہ وہ ہندوستان کی بیٹی ہے ۔اسے ان الف لیلوی حکایات کے بارے میں ذرا بھی شک نہ رہا جو وہ برصغیر کے متعلق سنتی چلی آئی تھی ۔

این بہت مخلص دوست ثابت ہوئی۔اس کا دردناک معاشرتی پس منظر اُسے ثریا کے قریب تر لے آیا۔وہ والدین کے پیار ومحبت سے کمسنی میں ہی محروم ہوگئی تھی ۔عزیزوں اور رشتہ داروں نے سرد مہری کا ثبوت دیا۔لیکن اس نے حالات کے آگے گھٹنے نہ ٹیکے ۔اس وقت وہ لندن یونیورسٹی میں ایم ۔اے کی طالبہ تھی۔

ثریا کا قیام لندن میں تین ماہ رہا۔اس قلیل مدت نے اُن کے درمیان حائل شدہ تمام فاصلوں کو پاٹ لیا۔وہ لندن جسے ثریا نے پسند نہ کیا تھا۔اب اسی لندن سے چلے جانے

کا خیال اُسے کچھ چُبھنے سا لگا تھا۔

اور جب وہ واپسی کے لئے عازم سفر ہوئی تو وقت رخصت این پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آنسو کسی طرح اس کی آنکھوں سے نہ تھمتے تھے۔

اب ان کا سہارا خطوط تھے۔ اور جب این نے فریڈرک سے شادی کی ثریا نے اسے قیمتی تحائف اور ڈھیروں پر خلوص دعائیں بھیجیں۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد فریڈرک کو ہندوستان میں معقول ملازمت مل گئی اور یوں این جس کی روح ہندوستان پہنچنے کے لئے بے قرار تھی۔ تسکین پا گئی۔

وہ ایک دوسرے کے پاس مہینوں گزارتیں تب بھی ان کا دل نہ بھرتا۔ دونوں بہت اچھی اُردو بھی بولنے لگ گئے تھے۔ این اور فریڈرک آج کل کوئٹہ میں مقیم تھے۔ اور کل ان کے پاس آرہے تھے۔

اور اگلے روز این اور فریڈرک ان کے ہاں پہنچ گئے۔ ان کی آمد سے سب کے چہرے خوشی سے گلنار ہو رہے تھے۔ سرمئی شام کا حسن دوچند ہو گیا وہ سب پائیں باغ میں آبیٹھے۔ فریڈرک اور ڈاکٹر اکرم گفتگو میں محو ہو گئے۔ ثریا اور این اپنی باتوں میں لگ گئیں۔ این کی ساڑھے تین سالہ معصوم بچی پنکی ثریا کے آٹھ سالہ بیٹے ہمایوں اور چار سالہ اور نگ زیب کے ساتھ معصوم باتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

''پنکی تم نے میرا نیا ہوائی جہاز نہیں دیکھا؟'' ہمایوں نے اسے سموسہ دیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' معصوم پنکی نے سر نفی میں ہلا دیا۔

''دیکھو گی؟''

''ضرور۔''

ہمایوں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔اور جب اس نے جہاز دیکھا تو اس کا ننھا منا سا وجود خوشی سے لرز سا اٹھا۔دونوں ہاتھ بجاتے ہوئے وہ چلائی۔

''اتنا خوب صورت جہاز۔''

''یہ جہاز میرے پھوپھا ابا جاپاں سے لائے ہیں۔''اس کے لہجے میں تفاخر نمایاں تھا۔

''پنکی اس آدمی کو دیکھ رہی ہو نا۔''ہمایوں نے اندر بیٹھے آدمی کی طرف اس کی توجہ مبذول کی۔

''اسے پائلٹ کہتے ہیں۔یہ جہاز اڑاتا ہے۔دیکھو جب میں اپنے ابو جتنا بڑا ہو جاؤں گا۔تو میں بھی پائلٹ بنوں گا۔جہاز اڑاؤں گا۔''وہ دونوں بازو فضا میں ہلاتے ہوئے چکر کاٹنے لگا۔

''مجھے اپنے جہاز میں بٹھاؤ گے نا۔''پنکی نے رشک کی نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں جہاز لے کر میں تمہیں کوئٹہ لینے آیا کروں گا۔ڈروگی تو نہیں۔''

اور ایک ہفتہ ان ہنستی مسکراتی باتوں میں گزر گیا۔جب وہ لوگ جانے کے لئے تیار ہوئے،تو ہمایوں مچل اٹھا۔

''امی آپ پنکی کو روک لیجئے۔''

وہ ماں کی ساڑھی کا آنچل پکڑے ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''کچھ پاگل ہو گئے ہو کیا؟''۔۔۔۔انہوں نے بیٹے کو ڈانٹا

''یوں مت کہو ثریا۔''اپن تیکھی نگاہوں سے انہیں گھورا۔

''تم ہمارے ساتھ چلو نا بیٹے!''وہ اس کے رخساروں کو تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

''آنٹی میں سکول جاتا ہوں ۔پنکی تو ابھی سکول نہیں جاتی ہے۔''

''پنکی بیٹے تم آنٹی اور ہمایوں کے پاس رہنا چاہتی ہو۔''

این نے بیٹی کی طرف دیکھا۔

''پنکی یہاں ہمارے پاس رہو گی نا۔''میں تمہیں اپنے سارے کھلونے دوں گا میرے کھلونے کتنے خوبصورت ہیں ۔وہاں میں اتنی ساری تتلیاں پکڑ کر دوں گا۔رہو گی نا۔''

وہ دونوں ہاتھ پھیلائے اتنے پیارے طریقے سے اس کی طرف جھکا ہوا تھا کہ سب بے اختیار ہنس پڑے۔

''ہاں میں رہوں گی۔''پنکی نے خوشی سے آنکھیں جھپکائیں۔

''ہم لوگ جائیں بیٹے۔۔۔''فریڈرک نے ہنستے ہوئے بیٹی سے پوچھا۔

''جایئے۔''پنکی نے فیصلہ صادر کر دیا۔

سب کا مشترکہ قہقہہ گونجا۔

''چلئے قصہ ختم ہوا۔''این نے شوہر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''ٹھیک ہے ہمایوں بیٹے ۔پنکی تمہارے پاس رہے گی لیکن ایک شرط پر۔۔۔''

''کیا؟۔۔۔''ہمایوں نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا۔

''نہیں این وہ ابھی بچی ہے۔تمہارے بغیر اداس ہو جائے گی۔''ڈاکٹر اکرم بولے۔

''نہیں ڈیڈی آپ مت بولیئے۔''ہمایوں فوراً چیخ اٹھا۔

''آنٹی آپ مجھے اپنی شرط بتایئے۔''وہ این کا فراک پکڑے مچل رہا تھا۔

''شرط یہ ہے کہ تم سب پندرہ بیس دن بعد میرے پاس کوئٹہ آؤ۔''

''دل نہیں بھرا ابھی کیا؟''۔۔۔۔ثریا بے اختیار مسکرا اٹھی۔

''مجھ سے پوچھنے کی بجائے بہتر ہے یہ سوال خود سے ہی پوچھ لو۔''

''کیوں امی؟ آپ چلیں گی نا۔'' وہ اب ثریا کا بازو پکڑے ہوئے تھا۔

''این بچوں کا کام ضد کرنا ہے۔پنکی کو یہاں چھوڑنا مناسب نہیں۔بہت چھوٹی ہے وہ۔اُداس ہوجائے گی۔''ثریا نے انہیں سمجھایا۔

''ارے دیکھوتو سہی۔ہمایوں کس قدر رنجی ہورہا ہے۔کیا ہے؟ چند دنوں کیلئے اگر میں اِسے یہاں چھوڑ جاؤں گی۔اِس بہانے چلوتم میرے پاس تو آسکو گی۔

میں جانتی ہوں ثریا این نے اُس کی طرف دیکھا۔تم پنکی کو مجھ سے زیادہ اچھا سنبھالوگی۔میں خود میں اور تم میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔''

محبت کے اِس بے پایاں اظہار پر بے اختیار ثریا کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

این نے جھک کر تینوں بچوں کو پیار کیا۔مُنہ ماتھے چومے۔جلد کوئٹہ آنے کا وعدہ لیا۔اور رُخصت ہوگئی۔

باب نمبر:۴

معصوم دلوں پر بہاروں کا راج تھا۔نینوں میں خوشیاں بسیرا کئے ہوئے تھیں۔ہونٹوں پر نغمے مچل رہے تھے۔گرمی کی شدت ،گھٹن اور لو کے احساس سے بے نیاز ہاتھوں میں ہاتھ دیئے وہ باغ میں چہکتے پھرتے۔پرندوں کے پر جمع کرتے اور فالسوں کے پودوں کے پاس بیٹھ کر کچے پکے فالسے مزے لے لے کر کھاتے۔سیمیں عارض گرمی سے دہک اٹھتے۔صبیح پیشانیوں پر موتیوں جیسے قطرے جم جاتے لیکن انہیں ان باتوں کی پروا کب تھی؟

ثریا کی احتیاطی تدابیر اور کڑی نگہداشت دھری کی دھری رہ جاتی۔ذرا موقعہ ملتا اور پنکی کا ہاتھ ہمایوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا۔گلابی گلابی منے منے پاؤں رقص کے سے انداز میں اٹھتے چلے جاتے۔جھومتے جھامتے بازو ہلاتے ،پل جھپکتے میں وہ وہاں پہنچ جاتے جہاں ثریا کو انہیں ڈھونڈنے میں کم از کم پندرہ بیس منٹ تو ضرور لگتے۔

سکول میں وقت گزارنا ہمایوں کے لئے عذاب تھا۔جونہی چھٹی کی گھنٹی بجتی وہ بیتابی سے کلاس روم سے نکلتا اور گیٹ سے باہر آتے ہی اس کی متلاشی نگاہیں کار کی تلاش

میں ادھر ادھر بھٹکنے لگتیں اور سنہری بالوں والی گڑیا کو کار میں بیٹھے دیکھ کر وہ پرسکون سا ہو جاتا۔آنکھیں چمک اٹھتیں۔اور پھر وہ اس کے قریب بیٹھ کر پچھلے چار پانچ گھنٹوں کی کار گزاری سُنا ڈالتا۔

موسم حد درجہ حسین تھا۔چودھویں کا چاند دھرتی کے سینے پر ضیاپاشی کر رہا تھا۔اندھیرے کہیں دور چھپے بیٹھے تھے اور اس فسوں خیز چاندنی میں وہ لان میں بچھے دودھیا بستروں پر نیم دراز خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''پنکی آج ہمارے جغرافیہ کے ٹیچر نے بتایا ہے کہ چاند زمین سے اتنا دور ہے اتنا دور.....''ہمایوں نے لفظ ''دور'' کو خاصا کھینچتے ہوئے کہا۔''کہ کوئی چیز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔''

''ہم گاڑی میں بیٹھ کر بھی چندا ماموں تک نہیں جا سکتے ؟''معصومیت سے اور رنگ زیب، پنکی نے بھی اُس کا سوال دُہرایا۔

''تو تو نِری پاگل ہے۔گاڑی چاند تک کب جاتی ہے؟''اس نے اپنی علمیت جتائی۔

''جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو جہاز لے کر چاند پر پہنچ جاؤں گا۔اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔''

''میں تم سے بھی پہلے چاند پر جاؤں گی۔''پنکی کا لہجہ خاصا تیز تھا۔

''وہ کیسے؟''ہمایوں نے اس طرف حیرانی سے دیکھا۔

''جہاز میں بیٹھ کر، میں بھی جہاز اڑاؤں گی۔''

''بیوقوف !لڑکیاں بھی کوئی جہاز اڑاتی ہیں۔''

''کیوں؟تم اڑاؤ گے تو میں بھی اڑاؤں گی۔وہ کسی طور اِس کی برتری ماننے کے

لئے تیار نہیں تھی۔

''کیوں اورنگ زیب؟'' اس نے چار سالہ اورنگ زیب کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بات کی تصدیق کرنا چاہی۔لیکن سوال کا جواب اثبات میں دے کر اورنگ زیب نے لڑائی کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔

دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ہمایوں کو دونوں پر سخت غصہ تھا۔پنکی پلنگ کی پٹی پر بیٹھی تھی۔آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ہمایوں نے اُسے زور سے دھکا دیا کہ معصوم بچی لڑھک کر نیچے جاگری۔لان میں کہیں کہیں کنکریاں بکھری ہوئی تھیں۔ایک نوکیلی کنکر ٹھوڑی میں لگی اور سوراخ کر گئی۔بچی درد کی تاب نہ لا کر چلا اٹھی۔غصے میں دھکا تو دے دیا۔لیکن اس کی چیخ سن کر وہ پریشان ہوا تھا۔تیر کی طرح کمرے کی طرف بھاگا۔

ثریا کے کانوں میں پنکی کے رونے کی آواز پڑی۔وہ رات کے کھانے کے لئے کچھ تیار کر رہی تھیں۔ویسے ہی چھوڑ کر باہر بھاگیں۔لپک کر اُسے اٹھایا۔اس کے گلابی گلابی چہرے پر لگے خون کو دیکھ کر اُن کے اوسان خطا ہو گئے۔اورنگ زیب کے بتانے پر کہ بھائی جان نے دھکا دیا ہے۔ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔فوراً مرہم پٹی کی گئی۔چوٹ زیادہ نہ تھی۔بچی کی طرف سے مطمئن ہو کر انہوں نے ہمایوں کو ڈھونڈا۔

وہ اپنے کمرے میں سہما بیٹھا تھا۔پہلی بار انہوں نے اُسے بری طرح مارا۔پھول سے رخساروں پر طمانچے پڑے تو وہ بلبلا اٹھا لیکن انہیں پنکی کی چوٹ مضطرب کر گئی تھی۔بیٹے کے بلبلانے پر اور بھی غصہ آیا۔

ننھا سا معصوم دل اپنی حرکت پر نادم تھا۔کافی دیر بعد سہمے سہمے قدم اٹھاتا ماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔لرزتے ہاتھوں سے اس نے پردہ ہٹا کر اندر دیکھنے کے لئے راستہ بنایا۔دزیدہ نگاہوں سے کمرے میں جھانکا۔پنکی بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور ثریا اس پر جھکی

ہوئی تھیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ بیٹے پر نگاہ پڑی بھڑک ہی تو اٹھیں۔غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے چلائیں۔

''یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

ڈانٹ اتنی سخت تھی کہ ہمایوں الٹے پاؤں پلٹ آیا اور اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

صبح اٹھا۔وہ بے کل تھا۔مضطرب تھا۔امی اس سے ناراض تھیں۔پنکی اس سے خفا تھی۔یہ روح فرسا احساس اس کے ننھے سے دل کو حد درجہ پریشان کیے ہوئے تھا۔ماما اسے تیار کرنے کے لئے آئی۔روتا ہوا پایا۔ثریا کو اطلاع دی۔

ممتا بے قرار ہو کر اٹھی۔اس کے کمرے میں گئیں۔بیٹے کو بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے اس کی پیشانی پر انگنت بوسے دیئے اور اس کے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''بیٹے تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے۔پنکی تمہاری مہمان ہے۔اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔رات بھر سے وہ اتنی بے چین ہے۔اور پھر سوچو میں تمہاری این آنٹی کو کیا بتاؤں گی؟ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔''

''امی مجھے معاف کر دیجئے میں آئندہ پنکی کو کبھی نہیں ماروں گا۔''وہ ماں کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

اور پھر چند دن بعد وہی ہمایوں تھا اور وہی پنکی۔ان کے رس گھولتے قہقہے فضاؤں میں بکھر کر ہر جانب رنگینیاں پیدا کر جاتے۔ہنستے کھیلتے،ہاتھوں میں ہاتھ دیئے مخملیں لان پر چہلیں کرتے پھرتے،اور اب وہ سب کوئٹہ جانے کے لئے تیار تھے۔اگلے روز ان کی روانگی

تھی ۔

اس رات کو ہمایوں اور اورنگ زیب آیا سے کہانی سن رہے تھے پنکی ثریا بیگم کے ساتھ مسز محمود کے ہاں گئی ہوئی تھی ۔نو بجے جب وہاں سے واپسی ہوئی تو وہ سیدھی ہمایوں کے کمرے میں گئی ۔وہ ثریا کے پاس سوتی تھی ۔لیکن لیکن کبھی کبھی ضد سے ہمایوں کے کمرے میں بھی سوجایا کرتی تھی ۔آج بھی وہ وہیں سونے کے لئے مچل اٹھی ۔۔۔۔ثریا خادمہ کو خاص تاکید کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئیں ۔

ساڑھے تین کا عمل ہوگا جب کمرہ اچانک پنکی کی چیخوں سے گونج اٹھا ۔ڈاکٹر اکرم اور ثریا ہڑ بڑا کر اٹھے ۔تیر کی طرح ثریا ہمایوں کے کمرے میں داخل ہوئیں ۔بچی کو بانہوں میں سمیٹ لیا ۔میاں بیوی باری باری اسے سینے سے چمٹائے پیار کر رہے تھے ۔

''آنٹی میری ممی ۔میرے ڈیڈی ۔''بچی تڑپ رہی تھی ۔ان کے بازوؤں سے نکلی پڑ رہی تھی ۔بار بار اس کی منہ سے ''ممی ۔ڈیڈی''الفاظ نکل رہے تھے ۔

''میں اسی لئے رضامند نہ تھا ۔اتنا بچہ ماں باپ کے بغیر نہیں رہ سکتا ۔''ڈاکٹر اکرم نے تشویش ناک انداز میں بیوی کی طرف دیکھا ۔

''خدا خیر کرے ۔معلوم ہوتا ہے بچی نے کوئی ہولناک خواب دیکھا ہے میں نے بھی آج این کے متعلق پریشان کن خواب دیکھا ہے ۔''

کافی دیر بعد بچی سسکتے سسکتے سوگئی ۔

صبح ہوئی ۔کیسی صبح تھی؟ ریڈیو لگایا ۔نیوز ریڈر کی آواز نے کروڑوں انسانی دلوں کو تڑپا دیا ۔

کوئٹہ ہولناک زلزلے کی بھینٹ چڑھ چکا تھا ۔

باوثوق ذرائع سے جب انہیں این اور فریڈرک کی موت کی اطلاع ملی تو گھر میں

صف ماتم بچھ گئی۔

باب نمبر:۵

بچپنے کی حدود سے نکل کر پنکی دھیرے دھیرے شباب کی رنگین وادی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

وہ شوخ و چنچل تو پہلے ہی تھی۔اب تو معاملہ دو آتشہ ہو رہا تھا۔اس کے نیلے نیلے نین کٹوروں میں زمانے بھر کی شرارتیں کروٹیں لیتی رہتیں۔ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کلیاں چٹکتیں۔ابھی یہاں ہے ابھی وہاں،ابھی ہمایوں کے پاس ہے تو ابھی اورنگ زیب کو تنگ کر رہی ہے۔ابھی ثریا کے گلے میں بانہیں ڈالے ان سے اپنی ضد منوا رہی ہے تو ابھی ڈاکٹر اکرم کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہے۔

این کی اس نشانی کو ثریا نے کس انداز میں پرورش کی،یہ بات کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔فریڈرک اور این کے حادثہ کے بعد ڈاکٹر اکرم کا خیال۔بچی کو انگریز حکومت کے سپرد کر دینے کا تھا۔لیکن ثریا اس بات پر رضامند نہ ہوئیں۔وہ بچی کو لے کر آبائی گاؤں چلی گئیں۔اس کا نام بدل کر رفعت رکھ دیا گیا۔کافی عرصہ وہ گاؤں میں مقیم رہیں۔اسی دوران ڈاکٹر اکرم کا تبادلہ دہلی ہو گیا اور وہ بچی کے ہمراہ نئی جگہ آ گئیں۔ان کے ملاقاتی انگریز

ہندو، مسلمان اور سکھ بھی تھے۔ بچی کو وہ اپنی مرحوم بہن کی نشانی بتایا کرتیں۔ یوں شک کا سوال بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ ثریا حسن میں یکتا تھیں۔ ڈاکٹر اکرم بھی نہایت وجیہہ اور خوش شکل تھے۔ ہمایوں اور اورنگ زیب بھی خوبصورت بچے تھے۔ لہذا وہ اُن میں اُوپری یا اجنبی ہرگز نظر نہ آتی۔ اس کی ہر شرارت کا مرکز ہمایوں ہوتا گو تنگ وہ اورنگ زیب کو بھی کرتی۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ ہمایوں کے بغیر اسے اپنی شرارتوں کا پھیکا پن خود ہی محسوس ہونے لگتا۔ گہری سیاہ راتوں میں اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے یونہی اس کی چلبلی طبیعت مچل اٹھتی۔ فوراً باہر نکلتی۔ ہمایوں کے کمرے کی کھڑکی کے قریب پہنچ کر ہاتھوں سے ذرا سا اسے کھولتے ہوئے شوخ لہجے میں کہتی۔

''ہیلو کیسا حال ہے؟''

فزکس کی کتابوں پر جھکا ہوا ہمایوں کا خوب صورت چہرہ اس آواز پر اوپر اٹھتا۔ اُسے یوں کھڑکی کا پٹ پکڑتے تیزی سے آنکھیں جھپکاتے دیکھ کر وہ مسکرا اٹھتا۔

اُسے مسکراتا دیکھ کر اگلے ہی لمحے کھڑکی کے پٹ سے اتنی تیزی سے چھلانگ لگاتی کہ اس تیزی کی بے اختیار داد دینی پڑتی۔ ہمیشہ وہ ان الٹے طریقوں سے ہی کمرے میں داخل ہوا کرتی۔ ہزار بار منع کرنے کے باوجود بھی اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔

''رفی سیدھی طرح کمرے میں کیوں نہیں آتی ہو؟ جس دن تمہاری ٹانگیں ٹوٹیں گی اس دن پتہ چلے گا۔'' ہمایوں بھنا اٹھتا۔

''ٹانگیں میری کیا ٹوٹنی ہیں؟ وہ تو ہوا بازوں کی ٹوٹا کرتی ہیں۔'' وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتی۔

ہمایوں اس جواب پر گہری مسکراہٹ سے اُسے گھورتا۔

''لیکن یوں بندروں کی طرح وارد ہونے کا مطلب؟'' وہ اسے مزید بھڑکاتا۔

''اچھا تو میں بندر رہوں اور آپ خود کیا ہیں؟'' وہ طنزیہ لہجے میں اس کی طرف دیکھتی۔

''میرے متعلق تو تم بہتر رائے کا اظہار کر سکتی ہو۔''

وہ ایک ثانیے کے لیے نگاہیں بند کرتی اور دوسرے لمحے تیزی سے آنکھیں جھپکتی ہوئی منہ اس کان کے قریب لے جا کر تمسخرانہ انداز میں کہتی۔

''ایک دم سے لنگور۔''

اور ہمایوں کا قہقہہ فضا میں بکھر جاتا۔

دن میں وہ بیسیوں مرتبہ اس کے کمرے میں آتی۔ اس کی اچھی اچھی چیزیں غائب کر دیتی۔ آراستہ پیراستہ کمرے میں صرف اس کا ایک راؤنڈ ہی کافی ہوتا۔ جوتے شوکیسوں سے نکل کر آتش دان پر پہنچ جاتے۔ صوفوں کے کشن صوفوں سے اتر کر زمین پر آ جاتے۔ ہر چیز تہ و بالا ہو جاتی۔ ہمایوں لاکھ سر پٹختا لیکن اُسے کب پرواہ تھی؟

زندگی البیلی شرارتوں اور بھرپور صحت مند قہقہوں کے جلو میں آگے بڑھ رہی تھی۔

باب نمبر:۶

پائیں باغ میں ایزی چیئرز پر گھر کے سبھی افراد چائے پینے میں مصروف تھے۔شمیمہ معہ اپنے بچوں اور شوہر کے آئی ہوئی تھیں۔خدیجہ بیگم بھی تشریف فرما تھیں۔ان سب لوگوں کی موجودگی کی وجہ ہمایوں تھا جو کل ہوابازی کے پانچ سالہ تربیتی کورس کے لئے انگلستان جارہا تھا۔بی۔ایس۔سی کرنے کے بعد وہ بمبئی فلائنگ کلب سے ایک سال کی ابتدائی ٹریننگ مکمل کر چکا تھا۔

گھر کے سبھی افراد نے اسے اس شوق سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اسے تو جیسے فضائے بسیط کی پہنائیوں سے عشق تھا تبھی تو ت اس کی ولولوں اور جذبوں کو ماں کی آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو سرد نہ کر سکے۔باپ کی شفقت آمیز ڈانٹ بھی متاثر نہ کر سکی۔پھوپھی اور دادی کی بے پناہ چاہت اور محبت کا والہانہ پن بھی اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکا سکا۔اس نے وہی کیا جو اس نے چاہا۔

خدیجہ بیگم بھی اس وقت خاصی ملول تھیں۔ثریا خود بھی دل گرفتہ تھیں۔جوان بیٹا دہکتی آگ کے شعلوں میں کود پڑا تھا۔

''میرے بیٹے خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔'' خدیجہ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دادی کا اضطراب، بے کلی اور تفکر ہمایوں سے پوشیدہ نہ تھا۔

''اماں بی آپ تو یونہی پریشان ہو رہی ہیں۔ ایک سچے مسلمان کو موت و حیات کے بارے میں خدا پر مکمل بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

''بیٹے میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں، لیکن تم نہیں جانتے ممتا ان باتوں کو نہیں سمجھتی۔''

ثریا اور شمیمہ کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

بمبئی کے ساحل پر جہاز روانگی کے لئے تیار تھا۔ عرشے پر کھڑا ہمایوں مغموم نظروں سے گھر والوں کو دیکھ رہا تھا۔

جہاز چلا تو ایک دلدوز چیخ رفعت کے منہ سے نکلی جو ثریا کے ساتھ لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ہمایوں جا رہا ہے۔ دور اس سے بہت دور۔ معصوم دل کٹا جا رہا تھا۔ وہ بھلا اس کے بغیر کیسے رہ سکے گی؟ کس حالت میں اُسے گھر لایا گیا۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔

یہ کیسی آگ تھی جو اس کے معصوم وجود کو جھلسائے جا رہی تھی۔ یہ کیسی انوکھی تڑپ تھی جس کا مفہوم اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ یہ کیسا درد تھا؟ جس سے وہ اچانک دوچار ہو گئی تھی۔

پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ کمروں کو گھورا کرتی ان مخصوص جگہوں پر جہاں ہمایوں بیٹھا کرتا تھا، وہ گھنٹوں بیٹھتی۔ متلاشی نگاہیں اس وجود کو تلاش کرتیں جو اس سے دور سات سمندر پار چلا گیا تھا اور اکثر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔

ہمایوں سے اُسے کتنا پیار تھااس کا کسی کو بھی اندازہ نہ تھا۔اس صورت حال سے ثریا اور ڈاکٹر اکرم بہت پریشان تھے۔کھانے کی میز پر جب وہ ہمایوں کو دیکھ نہ پاتی تو ثریا کے سینے سے لگ کر سسک اٹھتی۔

''ہمایوں بھائی کو واپس بلا لیجئے نا امی۔''

آنسو ثریا کی آنکھوں سے پھوٹ نکلتے۔اسے سینے سے لپٹائے وہ اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیتیں۔کتنی ہی دیر تک اس کا سر سہلاتی رہتیں۔تسلی و تشفی کے پیار بھرے الفاظ سے اس کے درد کی شدت میں کمی کرنے کی کوشش کرتیں۔ڈاکٹر اکرم اسے اپنے ساتھ ہسپتال چلڈرن وارڈ میں لے جاتے۔

اس کی نیلی جھیل جیسی آنکھوں میں روشنیاں کافور ہو گئی تھیں۔اور شوخ تبسم کہیں دور جا چھپا تھا۔

باب نمبر:۷

خواب میں انہوں نے دیکھا کہ وہ رفعت کو قرآن پڑھا رہی ہیں۔ان کے قریب ہی این ہمایوں کے ساتھ صوفے پر بیٹھی پیار بھری نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی ہے۔چہرے پر خوشیوں کے عکس لہرا رہے ہیں۔انہوں نے اسی لئے اب رفعت کو بلوایا تھا،وہ آج اس سے تفصیلی بات کرنا چاہتی تھیں کیونکہ اب وہ شعور کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

رفعت کمرے میں میں داخل ہوئی تو ان کی آنکھیں بند تھیں۔دبیز قالین کی وجہ سے اس کے قدموں کی چاپ انہیں سنائی نہ دے سکی۔ان پر جھکتے ہوئے رفعت کسی قدر متفکرانہ انداز میں بولی۔

''آپ کی طبیعت تو ناساز نہیں امی؟''

پیار کی شیرینی سے لبریز،اس آواز پر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور رفعت کے چہرے کو محبت سے ہاتھوں کے ہالے میں لیتے ہوئے بولیں۔

''میں ٹھیک ہو بیٹے! یہاں میرے پاس آجاؤ۔''رفعت ان کی پاس بیٹھ گئی۔

''بیٹے !فرصت میں مسز زبیر کے ہاں چکر لگا آنا ۔عائشہ بیمار ہے ان لوگوں نے کئی مرتبہ گلہ کیا ہے کہ رفی ہمارے ہاں نہیں آتی ۔''

''گولی ماریں مسز زبیر کو امی !۔۔۔۔وہ تو مجھے زہر لگتی ہیں ۔۔۔۔اتنی خوشامدی اور مکار ۔یوں واری صدقے ہوتی ہیں جیسے زمانہ بھر کی ممتا انہی کے سینے میں سمٹ آئی ہو۔''

رفعت کے اس انداز پر ثریا بے اختیار ہنس پڑیں ۔پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں ۔

''بیٹے !ہمسائے جو ہوئے ۔پڑوسیوں کے حقوق انسان پر بہت زیادہ ہیں ۔''

''بہتر ۔آج شام میں اورنگ زیب کے ساتھ جاؤں گی ۔''

کچھ دیر وہ خاموشی سے رفعت کی طرف دیکھتی رہیں ۔وہ مضطرب سی ہوگئی ۔

''امی کچھ کہنا چاہ رہی ہیں آپ شاید؟۔۔۔۔''وہ ان کی طرف جھکتے ہوئے بولی ۔

''ہاں بیٹے مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے ۔عرصہ دراز سے میں اس وقت کی تلاش میں تھی ۔''یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے رک گئیں ۔

رفعت کا رنگ بدل گیا ۔نیلگوں حسین آنکھیں پھیل گئیں ۔تبھی اس کے کانوں میں ثریا کی خواب ناک سی آواز پڑی ۔

''رفی !میں نے تمہیں جس انداز میں پالا ہے وہ یقیناً تم سے پوشیدہ نہیں ۔کون کہتا ہے کہ اپنا بچہ لے پالک سے زیادہ عزیز ہوتا ہے ۔کم از کم مجھ پر یہ بات صادق نہیں آتی ۔کاش کوئی میرے قلب کی عمیق گہرائیوں میں جھانک کر دیکھ سکتا کہ وہاں تمہارے لیے محبت کے کیسے جذبات موجزن ہیں ۔تم مجھے ہمایوں اورنگ زیب سے کہیں بڑھ کر پیاری ہو ۔اس لئے بھی کہ تم این کی بیٹی ہو ۔اور این میری ایک ایسی دوست تھی جس کی دوستی پر غرور

کیا جا سکتا ہے۔مہر و وفا کی پتلی جو ہمایوں کی مچلتی ہوئی خواہش کی تسکین کے لئے اپنے جگر گوشے کو میرے پاس چھوڑ گئی۔آہ این!''

ان کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگے۔

''میں نے تمہیں ایک راز بنائے رکھا۔تمہارے وجود کو دبیز پردوں میں لپیٹے رکھا،تا کہ کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔اوراس کا نتیجہ یہ ہوا تم مذہبی تعلیم سے بے بہرہ رہیں۔کئی بار سوچا کہ تمہیں اس منزل کی راہی بنا ڈالوں جس کی میں راہرو ہوں۔لیکن ضمیر ملامت کے ہتھیار لئے ارادے کی راہ میں حائل ہو گیا۔خلش نے بار بار مجھے یہ احساس دلایا کہ تم میرے پاس ایک دوست کی مقدس امانت ہو۔کہیں امانت میں خیانت نہ ہونے پائے۔

پھر تمہیں عیسائیت کی تعلیم دینے کے متعلق بھی غور کیا۔لیکن اس خواہش کی تکمیل خود کو برباد کرنے کے مترادف تھی۔علاوہ ازیں اسے تم خودغرضی کا نام دو یا کوئی اور۔میرے لاشعور میں ایک ایسی خواہش رچ بس گئی تھی۔جس سے خود کو محروم کر دینا مجھے کسی قیمت پر گوارہ نہ تھا۔تم ہمایوں کے لئے اور ہمایوں شاید تمہارے لئے تخلیق ہوا ہے۔تمہارے وجود میں ہمایوں کی تمناؤں کا رنگ چھلکتا ہے۔رفی! راستے تمہارے سامنے ہیں قدرت نے تمہیں شعور کی دولت بخشی ہے۔تم فیصلہ کر سکتی ہو کہ تمہیں اب کیا کرنا ہے؟ کون سی راہ تمہارے لئے مناسب ہوگی۔''

آنسو رفعت کی آنکھوں سے مالا کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ایک لمحے کے لئے اُس نے ثریا کی طرف دیکھا۔سسکی بھری اور دوسرے لمحے اس کی سر اُن کی گود میں تھا۔

''میری زندگی میری روح!۔۔۔۔۔''انہوں نے رفعت کا سر تھام کر سینے سے لگا

لیا۔ہونٹ اس کے سنہری بالوں کو چومنے لگے۔

''امی!۔رفعت آپ سے جدا ہو کر کبھی زندہ رہ سکے گی؟۔۔۔۔۔یہ تو سوچا ہوتا......میرا مذہب ......وہی ہے جو آپ کا......ہے......میرا دین وہی ہے......جس کی آپ ......پیروکار ہیں......امی......آپ نے یہ سب کچھ......کیسے سوچ لیا؟وہ ہچکیاں لے لے کر بری طرح رو رہی تھی۔

''بیٹے!ضمیر پر جو بوجھ لدا ہوا تھا اسے بھی تو ہلکا کرنا تھا۔تمہیں میری مجبوریوں کا احساس نہیں۔۔۔۔؟''

''میں یہ سب نہیں جانتی۔لیکن آپ نے یہ سوچا کیوں؟۔۔۔۔میں ثریا اور ڈاکٹر اکرم کی بیٹی ہوں۔۔۔۔ایلن اور فریڈرک کی نہیں۔۔۔۔''

''میری روح!۔۔۔۔''ثریا نے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر ثبت کر دیئے۔

کافی دیر بعد رفعت اپنے کمرے میں آئی۔خوشیوں کا نکھار چہرے پر تصدق ہو رہا تھا۔آرزوؤں کا خمار آنکھوں میں رچ رہا تھا۔اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

''ہمایوں۔۔۔۔ہمایوں۔۔۔۔ہمایوں۔''

زچ آ کر اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔لیکن یہ بیرونی دنیا کی آواز کب تھی؟جو یوں کانوں کو بند کر لینے سے وہ اسے سن نہ سکتی۔۔۔۔یہ تو دل کی پکار تھی۔

دل۔۔۔۔۔جو ہمایوں کی خیال سے ہی دھڑکنے لگتا۔

خوشی کے نغمے جن کے ہر بول میں اس کی آرزوؤں کا رنگ جھلکتا۔وہ تمناؤں کے لامتناہی پھیلے ہوئے خوش رنگ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبوں سے لطف اندوز ہوتی رہتی۔سپنوں میں کھوئی رہتی حتیٰ کہ مادی دنیا اُسے ان حسین تصورات سے باہر کھینچ لاتی۔لیکن

۔۔۔۔۔آج تو من کے تار ربری طرح بج اٹھے تھے۔آخر بجتے بھی کیوں نہ جب کہ اس کے کانوں نے شفقت سے لبریز شہد آگیں کلمات سنے تھے۔

''تم ہمایوں کے لئے اور ہمایوں تمہارے لئے تخلیق کئے گئے ہیں؟۔۔۔۔''

عجیب سا احساس ہوا۔سارا وجود لرز اٹھا۔یوں محسوس ہوا جیسے وہ راز جو دل کی گہرائیوں میں دفن تھا۔وہ معصوم لگاؤ،وہ پیار جسے وقت نے گہرا کرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی میں بدل دیا تھا اب طشت از بام ہو گیا ہو۔

''اف امی!''۔۔۔۔وہ سرتا پا لرز اٹھی۔

''اس کا مطلب ہے وہ ہمارے قلبی احساسات سے آگاہ ہیں۔''

وہ دونوں اب تک با قاعدگی سے ایک دوسرے کو خطوط لکھتے رہے تھے۔گو یہ خطوط سادگی کے حامل ہوتے تھے۔لیکن دل میں میں تو چور پیدا ہو گیا تھا۔

اور اب یہی بات اسے قابل اعتراض دکھائی دے رہی تھی۔۔۔۔

''ان زاویوں پر تمہارا انداز فکر درست نہیں۔کیا تمہیں وہ شفقت یاد نہیں،تمہیں اس محبت کا احساس نہیں جس کے تحت یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے۔خود سوچو تمہارے نام لکھے ہوئے ہمایوں کے خطوط بھی افراد پڑھتے ہیں۔اور رنگ زیب نے کبھی کبھی لطیف سی ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کی فوراً تردید کی اور چوٹ بھی کرنے سے نہیں چوکتا۔

''واقعی امی آپ بہت عظیم خاتون ہیں۔اتنی عظیم کہ آپ کی عظمت تک میرا ذہن رسائی سے محروم ہے۔آپ نے جس طرح میری پرورش کی۔شاید میری حقیقی ماں بھی نہ کر سکتی۔کتنے سالوں تک آپ نے اپنے احساسات چھپائے رکھے۔آپ ڈرتی تھیں کہ کہیں آپ امانت میں خیانت کی مرتکب نہ ہوں۔کاش آپ نے جانا ہوتا،یہ تو سمجھا ہوتا کہ مجھے اس مذہب سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے؟ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟میری عقیدت کس رنگ میں ڈھل

سکتی ہے۔میرے دل میں احترام کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟جب کہ میرے دل میں ان لوگوں کے خلوص کی روشنی جگمگا رہی تھی جن کی عظمت کردار کا گواہ ان کا ایک ایک فعل ہے۔

میں نے کبھی اس طور پر سوچا بھی نہ تھا۔کونونٹ میں مقدس کتاب کی گھنٹی بجتی۔بائبل پڑھائی جاتی۔باوجودیکہ میرے خمیر میں وہی دعائیں رچی بسی تھیں۔میرے کان سب سے پہلے اپنی دعاؤں سے آشنا ہوئے تھے۔مجھے ابتدائی سبق اسی کتاب کا دیا گیا تھا۔لیکن پھر بھی مجھے سب کچھ اجنبی اجنبی لگتا۔بادی النظر میں اس بیزاری اور اکتاہٹ کا عام تاثر یہی لیا جاتا کہ مسلمان گھرانے کی بچی ہونے کی وجہ سے دلچسپی کا اظہار کرنے سے قاصر ہے۔لیکن آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر میرا دل مچل اٹھتا۔اس سے شدت سے آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کی تمنا میرے دل میں پیدا ہوتی۔آپ کے ساتھ کھڑی بھی ہو جاتی۔لیکن کبھی اس سلسلے میں میری حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔۔۔۔۔پیار و محبت کی بوچھاڑ کچھ اتنی زیادہ تھی۔کہ میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔کبھی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش ہی نہ کی۔''

وہ آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے سر لگائے سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک کسی کے پاؤں کی آہٹ پر چونک اٹھی۔آنکھیں کھولیں تو اورنگ زیب کو ریکٹ پکڑے اپنے قریب کھڑے پایا۔اس کی آنکھوں میں شوخی نمایاں تھی۔

''طائر خیال انگلینڈ کی آزاد فضاؤں میں کسی کے ساتھ محو پرواز ہے شاید؟''

''ذہن کو اتنی لمبی چھلانگیں لگانے کی عادت نہیں ہے اورنگ زیب۔''وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''اوں ہوں۔اتنا مت بنئے رفی آپا!''وہ ہلکا سا اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''آپ ہر بات جھٹلا سکتی ہیں،لیکن ان آنکھوں کا کیا کریں گی جو کسی نام پر یوں جگمگا اٹھتی ہیں۔جیسے کوئی دیا جل اٹھے۔''

''اورنگ زیب! ۔۔۔۔'' وہ اسے مارنے کے لئے جھپٹی لیکن شوخ وشریر اورنگ زیب چھلانگیں لگاتا ہوا باہر جا چکا تھا۔

باب نمبر:۸

آتی بہار کی وہ حسین شام تھی ۔پائیں باغ میں ڈاکٹر اکرم اور ثریا بیگم باتوں میں محو تھے ۔ان کی گفتگو رفعت سے متعلق تھی ۔جو پچھلے چند دنوں سے خدیجہ بیگم کے پاس آگرہ گئی ہوئی تھی ۔اس کی عدم موجودگی کو گھر کا ہر فرد بری طرح محسوس کر رہا تھا۔گھر سونا سونا سا لگ رہا تھا۔ڈاکٹر اکرم نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ثریا ہمیں خدائے عظیم کا شکر ادا کرنا چاہیئے جس نے ہمیں رفعت سی بیٹی دی۔جو ہماری بیٹی بھی ہے اور مستقبل کی بہو بھی۔وگرنہ پال پوس کر جگر گوشوں کو یوں دوسروں کے حوالے کر دینا بڑا دل گردے کا کام ہے۔''

''لیکن دوسروں کی بیٹیاں کس بل بوتے پر لے آئے تھے؟''انہوں نے مسکراتے ہوئے گہری نگاہیں شوہر پر ڈالیں ۔

''بل بوتا تو آج بھی موجود ہے۔لیکن فقط لانے کا دینے کا نہیں۔''وہ بھی جواباً مسکرا دیئے ۔

''شکر کیجئے خدا نے آزمائش میں نہیں ڈالا ۔بڑے بڑے عالی حوصلہ لوگوں کے

پتے پانی ہو جاتے ہیں۔بیٹیاں چیز ہی ایسی ہیں گردنیں جھک جاتی ہیں۔''

''واقعی؟''۔۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب نے لمبی سانس بھری۔

''اورنگ زیب کے متعلق تمہارا کیا ارادہ ہے؟''انہوں نے استفہامیہ انداز سے بیوی کو دیکھا۔

''آپ کی کیا خواہش ہے؟''انہوں نے شوہر کا مطلب سمجھتے ہوئے ان کا عندلیہ لینا چاہا۔

''مجھے عصمہ اور نمو دنوں پسند ہیں (عصمہ ڈاکٹر اکرم کی بھانجی تھی اور نمو ثریا کی) آخری فیصلہ تمہیں کرنا ہوگا۔''

''وہ محبت جو آپ کو شمیمہ سے ہے۔اس میں میرا بھرپور تعاون آپ کو ہمیشہ حاصل رہا ہے۔میں بہن بھائی کے مثالی پیار کو مستقبل کی رشتہ داری سے مزید فروغ دینے کی متمنی ہوں۔مجھے نمو اور عصمہ دونوں عزیز ہیں لیکن عصمہ کو میں نے اس گھر کی بہو کی حیثیت سے بھی دیکھا ہے۔''

''اپنی خوش قسمتی پر جس قدر فخر کروں ثریا!وہ کم ہے۔''

انہوں نے محبت کی گہری نظریں بیوی کے سراپے پر ڈالیں اور پیار کی بھرپور چاہت سے بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''سمجھ میں نہیں آتا تمہارے پاس کون سا جادو ہے؟ جو تمہیں دل کی زبان سمجھا دیتا ہے!ثریا تم !نے ہمیشہ وہی کیا جو میں نے چاہا،وہی کہا جو میرے دل میں تھا۔جانے تم کیسے پوشیدہ جذبات سے آگاہ ہو جاتی ہو؟''

''آپ میرے لئے ایک ایسی کتاب ہیں جسے میں نے خلوص و محبت کی روشنی میں پڑھا اور کبھی دھوکا نہیں کھایا۔''

اتنے میں سیاہ رنگ کی ایک کار گیٹ میں داخل ہوئی ۔میاں بیوی کی متجسس نگاہیں اس پر مرکوز ہوگئیں ۔کار برساتی میں جا رک گئی ۔کشیدہ قامت اور پر وقار شخصیت کا نوجوان باہر نکالا ۔اور تیزی سے ان کی طرف بڑھا ۔

ثریا بیگم کو یوں لگا جیسے ان کے سامنے برق کوند گئی ہو ۔

''ہمایوں!'' بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔۔۔۔۔وہ خوشی کے بے پایاں احساس سے آنکھیں چھپکاتی ہوئی والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھیں ۔

تقریباً ایسی ہی کیفیت ڈاکٹر اکرم کی بھی تھی ۔

بیٹا ماں کی چھاتی سے لگا ہوا تھا ۔بازوؤں کے حلقے میں سمیٹے وہ اس کی پیشانی اور گھنے بالوں پر پیار بھرے بوسے ثبت کر رہی تھیں ۔شدت جذبات سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی زبان سے نکل رہے تھے ۔آنکھوں سے اشک رواں تھے ۔

یونہی کتنے ہی لمحے بیت گئے ۔

''چھوڑو ثریا'' ڈاکٹر اکرم نے ماں بیٹے کو جدا کیا ۔پرنم آنکھوں سے ہمایوں ''ڈیڈی'' کہتا ہوا ان سے لپٹ گیا ۔

''یہ چپکے چپکے کیسے چلے آئے ؟تم نے تو لکھا تھا ،میں مشرق وسطی سے ہوتا ہوا ہندستان آؤں گا ۔''انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں پوچھا ۔

''مشرق وسطی کی سیاحت کا پروگرام میں نے پھر کبھی پر اٹھا دیا اور خود چلا آیا ۔''وہ ان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولا ۔

''لیکن ہمیں اطلاع تو کرتے !۔۔۔۔''ڈاکٹر صاحب نے بیٹھے ہوئے کہا ۔

''میرا ارادہ پہلے آپ کو ٹرنک کال کرنے کا تھا ۔پھر سوچا اچانک پہنچنے میں زیادہ لطف رہے گا ۔۔۔۔۔دیکھ لیجئے کتنی خوشی ہوئی ہے ؟آپ کو پہلے اطلاع کر دینے سے ۔یقیناً

ایسا نہ ہوتا ۔۔۔۔"

"یہ منطق تم نے کہاں سے سیکھی؟" ڈاکٹر صاحب مسکرا اٹھے۔

"اور ہاں! بیٹا یہ کس کی کار میں آئے تھے تم؟ ۔۔۔۔" انہوں نے پوچھا۔

"خوش قسمتی سے ڈاکٹر ربانی ائیر پورٹ پر مل گئے ۔۔۔۔ یہ انہی کی کار تھی ۔۔۔۔"

وہ گھر جو تھوڑی دیر پہلے اداس اداس محسوس ہو رہا تھا۔ اب خوشیوں سے چمک سا اٹھا تھا۔ اورنگ زیب باہر سے آیا۔ بھائی کو دیکھا۔ نہال ہوا تھا۔ ہمایوں حیران تھا اور کسی قدر بے چین بھی۔ متلاشی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ ثریا بیگم کی نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں مچلتی انتظار کی کیفیات پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ لیکن وہ دانستہ خاموش رہیں۔

ڈاکٹر اکرم کو ہسپتال کسی خطرناک کیس کی وجہ سے جانا پڑا۔ جونہی وہ گئے ہمایوں ماں سے مخاطب ہوا۔

"امی! رفعت کہاں ہے؟"

اورنگ زیب کا گونج دار قہقہہ فضا میں اُچھلا۔ ثریا بیگم کے لبوں پر بھی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ہمایوں نے خجالت سی محسوس کی۔ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے امی؟"

"بات کیا؟ ۔۔۔۔ آپ کی بے تابی، آپ کی بے چینی کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔"

اورنگ زیب بولا۔ "شیطان۔" ثریا بیگم نے ہنستے ہوئے اورنگ زیب کو پیار بھری ڈانٹ پلائی اور ہمایوں کے کچھ بولنے سے پیشتر ہی وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

''بیٹے !وہ تمہاری دادی اماں کے پاس چند دنوں کے لئے گئی ہے۔اسے گئے آج چوتھا دن ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اسے گئے چار دن نہیں چار صدیاں بیت گئی ہوں۔''

''اس پیار کی شدت میں کچھ کمی کیجئے امی !ورنہ میں اس سے حسد کرنا شروع کر دوں گا۔''اورنگ زیب نے شرارتاً کہا۔

ثریا بیگم اور ہمایوں ہنس دیئے۔

''گویا ابھی یہ کیس مستقبل میں زیرِغور لایا جائے گا۔''ہمایوں نے شوخی سے بھائی کو دیکھا۔

''بھئی اگر حالات نازک صورت اختیار کر گئے تو یقیناً غور وخوض کی ضرورت محسوس ہوگی۔''

شام کی چائے پی کر وہ بھائی کے ساتھ کافی دیر باتیں کرتا رہا پھر اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چلا آیا۔

نامعلوم سی اُداسی اس پر چھائے جارہی تھی۔گہرا اضطراب اسے محسوس ہو رہا تھا۔رگ وپے میں بے چینی کی لہریں رقصاں تھیں۔دل و دماغ کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ مچلے جارہا تھا۔اس محبوب ہستی کو دیکھنے کی خواہش لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی تھی۔

کروٹیں بدل بدل کر وہ عاجز آگیا تھا۔منہ تکیے میں چھپانا چاہا۔آنکھیں بند کر کے سونا چاہا۔لیکن ہر حربہ،ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی ایک من موہنی صورت ہر طرف رقصاں تھی۔

آنکھیں کھولیں،پھر بند کیں۔بیتے ہوئے خوشگوار دن ماضی کے دریچے سے چھلانگیں مارتے،اُچھلتے کودتے سُورج کی روپہلی کرنوں کیطرح اُس کی بند آنکھوں میں گھستے

چلے جا رہے تھے۔

وہ دن جو اُس کی زندگی کا سرمایہ تھے۔وہ دن جو اس کی معصوم پیار اور لگاؤ کے امین تھے۔

وہ دن جب پیار ننھے مُنے شگوفوں کی صورت تھا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ چٹک کر پھول اور کلیوں میں بدل گیا تھا۔

باب نمبر:۹

وہ نگاہوں میں شوق وآرزو کی دُنیا لیے پلنگ پر خوابیدہ اس ہستی کو دیکھ رہا تھا جو اس کے دل کی دھڑکن تھی ۔۔۔۔۔اس کے خوابوں کی حسین تعبیر تھی ۔

دھیرے دھیرے دبیز قالین پر قدم رکھتا ہوا وہ اور آگے بڑھ آیا۔تبسم اس کی آنکھوں میں پھیلتا جارہا تھا۔یہ رفی ہے۔۔۔۔اسے یقین نہیں آرہا تھا۔کلیوں جیسی معصومیت اور پھولوں جیسی شگفتگی لئے اس کا چہرہ کس قدر دلفریب لگ رہا تھا۔

وہ ذرا سا جھکا۔اس کی ٹھوڑی کا وہ زخم جس سے ایک تلخ اور حسین یادوابستہ تھی دکھائی دیا۔یہ نشان جو بچپن کے دور کی یادگار تھا۔اور بچپن !۔۔۔۔۔بے اختیار اس کی نگاہیں دریچے سے باہر فضا میں گھورنے لگیں۔یادوں کا طوفانی ریلا اسے ایک تنکے کی طرح بہا کر اس دنیا میں لے گیا جو حسین بھی تھی اور دلفریب بھی۔گرما کی تپتی سلگتی دوپہریں یاد آئیں۔سرما کی یخ بستہ صبحوں اور ٹھنڈی شاموں نے اُس کا دامن کھنچا۔بہار کے چمکتے اور ساون کے رم جھم برستے دنوں میں ایک معصوم جوڑا باغ کی روشوں پر ہاتھوں میں ہاتھ دیئے کمروں، برآمدوں میں، درختوں کے نیچے اٹکھیلیاں کرتا اس کے تصور میں ابھرا۔

آج وہی معصوم جوڑا کتنی منازل طے کر گیا تھا۔وقت نے انہیں سنجیدگی اور متانت سونپ دی تھی۔

ایک بھرپور نظر اس نے دوبارہ رفعت پر ڈالی۔شدت سے اس کا دل چاہا کہ اسے جگا دے۔نیند کا خمار لئے آنکھیں جب کھلیں گی حیرانی اشتیاق اور محبت کے ملے جلے جذبات کا گلابی رنگ اس کی حسین آنکھوں سے چھلکے گا وہ سماں کیسا پرلطف ہوگا۔خواہش کو وہ تکمیل کا جامہ پہنانا ہی چاہتا تھا۔جانے ایک دم کیا خیال آیا؟ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر لبوں پر شوخ سی مسکراہٹ لئے وہ باہر آ گیا۔

''کیوں بیٹے؟ رفعت نے تمہیں پہچان لیا؟۔۔۔؟خدیجہ بیگم نے پیار بھری نظروں سے پوتے کو دیکھا۔

''اماں بی!۔۔۔وہ سو رہی ہے اور میں نے اُسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔''

خدیجہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔پوتے کو اس روپ میں دیکھ کر وہ کھلی جارہی تھیں۔

رفعت سو کر اٹھی۔۔۔خدیجہ بیگم کے پاس جانے کے ارادے سے باہر آئی۔برآمدے میں سے گزرتے ہوئے اس نے گل بانو کو پکارا۔

''صاحبزادی صاحبہ! صاحبزادہ ہمایوں آئے ہیں۔''

''ہمایوں۔''اس نے حیرت خوشی سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے خود سے کہا۔

''وہ آ گیا ہے۔جس کا انتظار اب گراں گزرنے لگا تھا۔جس کی دید کے لئے اب آنکھیں شدت سے بے تاب تھیں۔وہ کیسا ہوگا؟''

اس نے قدم آگے بڑھانے چاہے۔لیکن حجاب اور ہچکچاہٹ پاؤں کی زنجیر بن گئی۔قدم بوجھل ہو گئے۔اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

کھڑکی سے سر ٹکائے وہ باہر فضا میں گھور رہی تھی جہاں قوس قزح کے حسین رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ سرمئی شام کا حسن دل میں جذبات کے طوفان اٹھا رہا تھا۔

خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور خدیجہ بیگم کا پیغام اُسے سنایا۔

''اف! کیسے جاسکوں گی؟''

اماں بھی وہاں موجود ہوں گی۔ اس تصور سے ہی اس کے رخسار سلگ اٹھے اور اس نے خادمہ سے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر دیا۔

خدیجہ بیگم پریشان ہو اٹھیں۔ اسے دیکھنے کے لئے اٹھنا چاہتی تھیں کہ ہمایوں ان کے گھٹنے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولا۔

''اماں بی! آپ تشریف رکھیے میں دیکھ کر آتا ہوں۔''

''میں آسکتا ہوں؟۔۔۔'' اس نے پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس آواز پر اس کا دل تیزی سے دھڑکا، صراحی دار گردن کو تیزی سے جنبش ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ شہزادوں جیسا وقار و تمکنت لئے وہاں اس کا اپنا ہمایوں تھا۔ وہ بے سدھ کھڑی تھی۔ وقت کا سارا پیکر اسی ایک لمحے میں مقید ہو گیا تھا۔ گردش کرتی ہوئی کائنات ٹھہر چکی تھی۔ اور اسے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی دھڑکنا بھول گیا ہو۔

اس کا یہ انداز بے خودی ہمایوں سے بہت کچھ کہہ گیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔

''رفی۔۔۔ تمہیں میری آمد سے خوشی نہیں ہوئی۔۔۔ تمہاری خاموشی مجھے تفکر میں ڈال رہی ہے۔'' معصوم مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر آئی۔

لیکن وہ خاموش تھی۔ حسین آنکھوں پر گھنی پلکوں نے سایہ کیا ہوا تھا۔

''رفعت!۔۔۔ دیکھو تو سہی کون آیا ہے؟'' ہمایوں کا لہجہ پیار کی شدت سے

بوجھل تھا۔

''تم نے مجھے پہچانا بھی رفی ؟'' ہمایوں نے قصداً کہا۔

تڑپ کر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔شکوہ نمایاں تھا۔یوں جیسے نگاہوں کی زبان کہہ رہی ہو''یہ تم نے کیا کہہ دیا ہے ہمایوں؟ کیا کبھی اپنی زندگی بھی کسی کے لئے اجنبی ہوتی ہے؟تم میری روح کی پکار ہو،اورروح کی پکار سے بھی کبھی کوئی غافل رہ سکتا ہے۔''

''خاموشی کے اس طلسم کو توڑو نا رفی۔''

ہمایوں کے مضبوط ہاتھ اس کے شانوں پر آ گئے۔سازِ ہستی کے خوابیدہ تار انگڑائی لے کر جھنجھنائے اوران تاروں سے دلکش نغمے پھوٹ پڑے۔فضا میں جل ترنگ بجنے لگا۔اورروح لطیف احساسات میں ڈوبتی چلی گئی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے ہمایوں یہ تم ہو۔میرے اتنے قریب۔

ایسے لحات کے متعلق میں نے ہمیشہ تصور ہی کیا تھا۔یہ تو گمان بھی نہ تھا یہ تصور کسی دن اس طرح حقیقت میں بدل سکتا ہے۔''رفعت کا لہجہ خواب ناک تھا۔

''آؤاب چلیں۔اماں بی چائے کے لئے ہماراانتظار کر رہی ہوں گی۔۔۔۔۔''

ان کے مثالی پیار سے گھر کا ہر فرد واقف تھا۔دیکھنے والے جانتے تھے کہ بچپن کی یہ شدید چاہت وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی جائے گی۔

خدیجہ بیگم یہ جاننے پر کہ وہ ابھی کل آیا ہےاورآج آگرہ بھی آگیا ہے۔مسکرائے بنا نہ رہ سکی تھیں۔دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جب ان کے کمرے میں داخل ہوئےتو انہوں نے دیکھادونوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔رفعت کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں شمعیں سی روشن تھیں۔

''اللہ نظر بد سے بچائے۔میرے خاندان کے یہ حسین چراغ ہمیشہ روشن اوردمکتے

رہیں۔آمین!‘‘۔۔۔۔۔انہوں نے عجز سے خدا کے حضور دعا مانگی۔

’’بیٹے !۔۔۔۔۔تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا ۔۔۔۔۔‘‘انہوں نے رفعت سے پوچھا۔

’’جی ہاں!۔۔۔۔۔اماں بی، میں بالکل ٹھیک ہوں ۔۔۔۔۔‘‘

’’اماں بی آپ تیار ہو جائیں۔کل ہم لوگ دہلی جا رہے ہیں۔‘‘

’’بیٹے اس بڑھاپے میں مجھے کہاں گھسیٹے پھرو گے؟‘‘

’’یہ گھسیٹنے کی ابھی اچھی کہی۔کیا آپ میرے ساتھ کچھ دن مزید گزارنا نہیں چاہتیں۔اگلے ماہ مجھے بمبئی اپنی ملازمت پر چلے جانا ہے۔‘‘

’’میرے چاند!میری بوڑھی و ناتواں ہڈیوں میں اب تمہاری خوشیاں دیکھ کر ہی جینے کی حرارت پیدا ہوتی ہے۔‘‘

ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔۔۔۔۔رفعت کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

’’بہادر انسان موت سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوئے اماں بی!‘‘اس نے کپ میز پر رکھ دیا اور خود باہر چلا گیا۔

’’کاش مرزا صاحب آج زندہ ہوتے تو پوتے کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو اٹھتے۔۔۔۔‘‘خدیجہ بیگم نے حسرت سے کہا۔

باب نمبر:۱۰

شجاح الدین لاج کے درو دیوار پر ان دنوں خوشی و شادمانی کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔کھنکتے قہقہے، فضاؤں میں اچھلتے اور ہر سو رنگینیاں بکھیر جاتے۔لاج کو دلہن کی طرح آراستہ کیا جارہا تھا۔ڈاکٹر اکرم اور شمیمہ خانم کے شوہر اسد علی بیرونی انتظامات میں منہمک تھے۔خواتین اندر کے کاموں میں الجھی ہوئی تھیں۔

خدیجہ بیگم کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔آخر کیوں نہ دمکتا۔اس گھر کے چراغ کو شادی کی سنہری و خوش رنگ زنجیر پہنائی جارہی تھی اور وہ خوش اور شکر گذار تھیں کہ پوتے کی شادی دیکھ رہی تھیں۔دلہن بھی یہیں تھیں اور دولہا بھی بس آج کل میں آنے والا تھا۔

اورنگ زیب اس وقت رفعت کے کمرے میں ہے۔لمبی میز پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے ہیں اور میز کے گرد کرسیوں پر رفعت، اورنگ زیب، نمو، عصمہ، نعیم (شمیمہ کا بڑا لڑکا) اور عالیہ (عصمہ کی بڑی بہن) بیٹھے ہیں۔اورنگ زیب کی ساتھی عالیہ اور رفعت، نعیم کی پارٹنر ہے۔کھیل اپنے عروج پر ہے۔رفعت بظاہر کھیل میں مگن ہے لیکن اس کا

ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہے۔شادی میں صرف دو دن رہ گئے ہیں اور ہمایوں ابھی تک نہیں پہنچا۔

یہ فضاؤں میں اڑتے دیوہیکل جہاز کون جانتا ہے کب کسی کی خوشیاں چھین لیں۔مشینوں کی یہ ایجادات کسی کے دل کی دنیا کے لئے کبھی کبھی موت کی پیامبر بن جاتی ہیں۔۔۔۔اس کا بس چلتا تو وہ کبھی ہمایوں کو جہاز نہ اڑانے دیتی۔۔۔لیکن وہ مجبور تھی۔ہمایوں کو تو جیسے فضاؤں سے جنون کی حد تک عشق تھا۔

باہر شور سا ہوا۔رفعت کا دل دھڑک اٹھا۔اورنگ زیب کے کان کھڑے ہو گئے۔سبھی سوالیہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔نموباہر بھاگی۔جس تیزی سے وہ باہر لپکی تھی اسی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔اور خوشی سے چلائی۔

''ہمایوں بھائی آ گئے۔''

دھنک جیسے خوب صورت رنگ آسمانی دنیا سے اتراتے مسکراتے اترے اور اس البیلی شہزادی کے چہرے پر پھیل گئے۔حسین مسکراہٹ اس کے گداز گلابی ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔اور نین نشیلے کر گئی۔

''عصمی!۔۔۔۔ذرا رفی آپی کو شیشہ دکھاؤ۔دلہا کی آمد کا سن کر ان کے چہرے پر رنگوں کی جو حسین قوس قزح نظر آ رہی ہے۔اس کی زیارت یہ خود بھی کر لیں۔

''اورنگ زیب!''رفعت نے اسے گھورا۔

''جی فرمایئے۔۔۔۔''وہ شوخ انداز میں اس کی طرف جھکا اور مسکراتی آنکھیں اس کی حسین آنکھوں میں ڈال دیں۔

''باز آؤ۔''رفعت کا لہجہ قدرے غصیلا تھا۔

''جی۔۔۔۔چاہتا تو یہی ہوں۔مگر کیا کروں چہرے پر پھیلے دلی احساسات کی

یہ دلکش کیفیت مجھے کچھ کچھ کہنے پر اکساتی ہے۔"

''چٹکیوں میں اڑاتے ہو۔'' رفعت مسکرائی۔

''توبہ توبہ، یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے آپ کو اڑا کر مجھے جوتیاں کھانی ہیں۔''

''اورنگ زیب پٹنا چاہتے ہو کیا مجھ سے؟''

''ضرور۔۔۔۔لیکن عالی جاہ سزا دینے سے قبل مجرم کو اپنی صفائی کا موقعہ دیا جاتا ہے۔اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے واقعی مجرم بنا کھڑا تھا۔

عصمہ، نمو اور نعیم نے تالیاں بجائیں۔

''اجازت ہے۔'' رفعت کے لہجے میں تحکمانہ شان تھی۔

''ہر میجسٹی رفعت ہمایوں!۔۔۔۔۔سب کچھ دیکھتے ہوئے خاموش رہنا میرے بس میں نہیں۔''

کمرے میں قہقہوں کا طوفان پھٹ پڑا۔

باہر سے کسی نے اورنگ زیب کو آواز دی۔

''کوئی پیغام؟۔۔۔۔۔بندہ پیغام رسانی کے لئے تیار ہے۔'' وہ اس کی طرف جھکا۔

رفعت نے بالوں سے پکڑ کر اُسے جھٹکا دیا۔

''بھاگو! تم جیسے قاصد کے ہاتھ نامہ پیام سے میں ایسے ہی بھلی۔''

اور وہ تیزی سے خود کو چھڑا کر باہر بھاگ گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے بقیہ لوگ بھی ہمایوں سے ملنے کے لئے باہر نکل گئے۔جب یہ

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب .
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups
/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

لوگ وہاں پہنچے۔ ہمایوں کو رشتہ دار خواتین اور لڑکیوں میں گھرے دیکھا۔مذاق کے حملے خاصے شدید تھے۔اکثریت کا اعتراض تھا کہ وہ اتنی دیر سے کیوں پہنچا ہے؟زچ آ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''لیجئے بندہ حاضر ہے۔تاخیر کی جو سزا چاہے دے دیں۔''

''دولہا بننے کے آداب سیکھئے۔''کسی شوخ و شنگ لڑکی فقرہ کسا۔

''آپ ہی سکھا دیجئے۔اس فن میں خاصی ماہر معلوم ہوتی ہیں۔''اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

طویل سفر سے وہ بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔سونا چاہتا تھا۔لیکن مہمانوں سے بھرے اس گھر میں آرام کرنا اسے خاصا مشکل نظر آ رہا تھا آخر وہ خدیجہ بیگم کے پاس پہنچا۔انہوں نے اپنے کمرے میں لٹا کر کمرہ خالی کر دیا۔

شام کو نعیم کمرے میں داخل ہوا اور اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''اٹھو یار! کیا بوریت پھیلا رکھی ہے؟''نیند سے بھری ہوئی آنکھیں کھلیں اور اپنے سامنے نعیم کو پا کر دوبارہ بند ہو گئیں۔

''افیمی کہیں کے اگر دیدارِ محبوب کرنا چاہتے ہو تو آؤ چلیں، پائیں باغ حسن کے جلوے لٹا رہا ہے۔''

آنکھیں کھل گئی تھیں، وہ تیزی سے اٹھا، چپل پہنے اور باہر کی طرف لپکا۔نعیم ابھی کمرے میں ہی تھا اس کی تیزی دیکھ کر طنز سے مسکرایا۔

''پاؤں میں پہیئے کیوں لگ گئے؟''

''تم نے گاؤدی ہو۔خود لگا کر مجھ سے پوچھتے ہو؟''

''اتنی بے تابی بھی اچھی نہیں۔سمجھے! ''نعیم نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ

دیا۔

''ہوں۔میرا خیال ہے وہاں عالیہ نہیں ہے شاید؟''

''بیارے اگر عالیہ وہاں نہ ہوتی تو تمہیں بلانے کبھی نہ آتا۔''

کوٹھی کے اوپر سے ہوتے ہوئے وہ دونوں وسیع پائیں باغ کی پچھلی باڑ تک جا پہنچے۔باڑ کی چھوٹی چھوٹی درزوں میں سے ہمایوں نے جھانکا۔واقعی پائیں باغ میں حسن کی رنگینیاں بکھری پڑی تھیں۔خاندان بھر کی لڑکیاں وہاں موجود تھیں۔آم کے درخت کے نیچے صوفے پر رفعت،اور رنگ زیب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔شوخ قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔زرد لباس میں ملبوس وہ شمع کی مانند تمکنت سے بیٹھی تھی اُسے چھیڑا جا رہا تھا۔

اور وہ حجاب آلود مسکراہٹ چہرے پر لئے ان کے مذاق سے محفوظ ہو رہی تھی۔

خادمہ اورنگ زیب کو بلانے آئی اور رفعت کے ساتھ والی جگہ خالی ہوگئی۔اس خالی جگہ کو دیکھ کر ہمایوں کے دماغ میں برق کی طرح ایک خیال آیا۔آنکھیں چمکیں۔آہستگی سے اس نے نعیم کے کان میں سرگوشی کی۔

''نہیں نہیں تمہیں کہیں چوٹ نہ آجائے۔''نعیم نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔

''چھوڑو بھئی !کوئی خطرے والی بات نہیں ! تم اُدھر سے آؤ۔''

آم کا درخت آدھے سے زیادہ باڑ سے باہر پھیلا ہوا تھا۔مضبوط سی ایک شاخ کو پکڑ کر ہمایوں اس کے ساتھ جھول گیا۔جگہ کا نشانہ لیا اور تیز جھول لیتا ہوا وہ اگلے لمحے صوفے پر رفعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

پہلے تو وہ سب دنگ رہ گئیں۔لیکن دوسرے ہی لمحے قہقہوں کا طوفان امنڈ آیا۔سبھی چیخ اٹھیں۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے ہمایوں بھائی؟''

''آپ کو یہاں آنے کی اجازت کس نے دی؟''عصمہ چیخی۔

''کیا یہ ممنوعہ علاقہ ہے؟ فائزہ نے طنز سے کی۔

''یہ علاقہ ممنوعہ نہیں محترمہ۔ بلکہ اِن ذات شریف کی دید ممنوعہ بن گئی ہے۔''وہ رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

مسرت کے پایاں احساس سے اس کا چہرہ گلنار ہو اٹھا۔ دز دیدہ تبسم ہونٹوں پر ہزار روکنے کے باوجود نمایاں ہوئے بغیر رہ سکا۔

''یہاں سے چلے جایئے، ورنہ میں ابھی اماں بی کو اطلاع دیتی ہوں۔''نمو چلائی۔

''کیا کہنے ہیں، مینڈکی کو بھی زکام ہو رہا ہے۔ خیر سے بی نمو ہی نہیں مان۔''ہمایوں اطمینان سے مسکرایا۔

''اللہ:۔ جایئے نا ہمایوں بھائی۔''عصمہ نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''ہرگز نہیں جائیں گے کمبختو! اتنا تو سوچو جان جوکھوں میں ڈال کر کس طرح یہاں تک آئے ہیں۔ کم از کم اِس شانِ نزول کی تھوڑی بہت تو عزت رکھ لو۔''

نعیم عالیہ کے قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہمایوں نے تیکھی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے نمو کی توجہ اُن کی طرف مبذول کی۔

''یہ نگاہِ عتاب اب میری بجائے اُدھر منتقل ہو جانی چاہیئے۔''

دُور سے ثریا بیگم کو آتے دیکھ کر ہمایوں نے اب کھسک جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

''کہاں چلے بیٹھئے نا؟''فائزہ نے چوٹ کی۔

''ابھی آتے ہیں۔''ہمایوں نے بھاگتے ہوئے منہ چڑایا۔

جمعہ کے دن عصر اور مغرب کے درمیان نکاح ہوا۔ عشائیہ میں معززین شہر کے

علاوہ انگریزوں اور ہندوؤں کی بھی بھاری تعداد نے شرکت کی۔

باب نمبر:۱۱

چائے کی ٹرے ہاتھ میں پکڑے رفعت خواب گاہ میں داخل ہوئی۔نیلگوں مدہم روشنی میں ڈوبی ہوئی خواب گاہ اور گہری نیند سوتا ہوا ہمایوں اسے کسی افسانوی دنیا کا شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔چائے کی ٹرے آہستگی سے چھوٹی میز پر رکھتے ہوئے اس نے پیار سے بھرپور نظریں ہمایوں پر ڈالیں اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ اس پر جھک گئی۔اس کے سیاہ گھنے بالوں سے کھیلتے ہوئے بے اختیار اس نے سوچا۔

واقعی مسز کھنہ درست کہتی ہیں کہ ہمایوں پر کسی یونانی دیوتا کا گمان پڑتا ہے۔دیوتا جو پرستش کے لئے ہوتے ہیں۔جن کی مورتی من مندر میں سجا کر رکھنے سے دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔"

کلاک کی آواز نے اس کی سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔بے اختیار نگاہیں اٹھ گئیں اور سوئیوں پر سے پھسلتی پھسلتی اس تصویر پر جا ٹکیں جو کلاک کے نیچے آویزاں تھی۔تصویر میں وردی میں ملبوس ہمایوں جہاز کے کاک پٹ میں داخل ہو رہا تھا۔کتنی ہی دیر تک وہ خالی خالی

نظروں سے تصویر کو دیکھتی رہی۔ہونٹوں کے گوشے پھڑ پھڑاتے رہے۔آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی اترنے لگی۔۔۔۔۔ہمایوں کی ہوابازی اس کی خوشیوں کے گلے میں ایک پھانس تھی۔ایک چبھن تھی جو اسے مضطرب کر دیتی۔

جیون کا سارا حسن ساری رعنائی اس کے قدموں میں آسمٹی تھی۔اس کے خوابوں میں شوخ شوخ رنگ بھر گیا تھا۔محبت کی شگفتہ ہواؤں میں اُسے پیار کے دلکش نغمے سنائی دینے لگے تھے۔

اسے ہمایوں کے پاس آئے دو ماہ ہو رہے تھے۔شاندار فلیٹ پر کسی چھوٹی سی جنت کا گمان ہوتا تھا۔شوخ وشنگ تتلی کی طرح وہ اس میں اِدھر سے اُدھر اڑتی پھرتی۔

لیکن۔۔۔۔

ہمایوں کا فلائیٹ پر جانا اس کے لئے قیامت بن جاتا۔خوشیاں کہیں دُور بھاگ جاتیں۔چہرے پر اُداسی کے رنگ بکھر جاتے۔پلکوں کی چلمن میں چُھپی گھٹائیں برسنے کے لئے بے چین ہو جاتیں۔وہ ہزار ضبط کرتی۔اندیشوں کو جھٹلانے کی کوشش کرتی۔لیکن موتیوں کے شفاف قطرے اُس کے عارضِ سیمیں پر پھیل پھیل جاتے۔

اس سے ہمایوں اسے ڈھیروں تسلیاں دیتا۔زندگی اور موت کے متعلق سمجھاتا۔لیکن ان باتوں کا اثر تھوڑی دیر رہتا اور پھر اس کا دل اندیشوں کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگتا۔

ابھی تک ہمایوں کی فلائٹ بمبئی سے رنگون تک تھی۔لیکن جلد ہی کراس کنٹری فلائٹ شروع ہونے والی تھی۔ہندوستان کی فضائی کمپنی میں اسے بہترین ہواباز تسلیم کیا جاتا تھا۔انگریز ہوابازوں نے بھی اس کی مہارت کا اعتراف کیا تھا۔اور جب سے بیرون مُلک پروازوں کا علم رفعت کو ہوا تھا۔اس کا تفکر کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

ہمایوں نے کروٹ بدلی۔اور آنکھیں کھول دیں۔کہنیوں کے بل اپنے چہرے پر جُھکے اسے دیکھتے ہوئے وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔اس کی کلائیوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس نے خواب آلود لہجے میں اُسے پکارا۔تصوراتی دنیا سے وہ واپس لوٹ آئی اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کا معصوم چہرہ مسرت کی ضیا سے جگمگا اٹھا۔

چائے کا کپ اُسے تھماتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی۔

"ہمایوں گھر چلئے۔مجھے امی بہت یاد آرہی ہیں۔"

"اس بار کی فلائٹ کے بعد انشاءاللہ گھر جائیں گے۔"

"فلائٹ کب ہے؟"اس کا لہجہ یک دم ڈوب گیا۔۔۔۔

"آج شام۔۔۔۔"

"اتنی جلدی۔۔۔۔"اضطراب سے اس کے منہ سے نکلا۔

"اس بار مجھے لندن جانا ہے۔"

"لندن!"

آواز اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔جگمگاتا چہرہ بجھ گیا۔

"رفعت!۔"ہمایوں کی آواز بوجھل تھی۔

"یہ گھمبیر اداسی۔یہ گہرے گہرے دکھ کے سائے تمہارے چہرے پر کیوں امنڈ آتے ہیں؟کتنی بار سمجھاؤں تمہیں کہ موت کا وقت معین ہے۔انسان فضاؤں میں محو پرواز ہو یا زمین کی سطح پر چلتا پھرتا ہو۔موت کو ٹالا نہیں جا سکتا۔اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا نہیں جا سکتا۔

رفی!۔۔۔۔یہ تمہارا گہری اداسی لئے چہرہ مجھے اس وقت مضطرب کر دیتا ہے۔جب میرا جہاز فضا کی وسعتوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔تمہاری پلکوں پر جمے آنسو

میرے کسی گوشہ تصور میں ابھرتے ہیں اور بے چین کر جاتے ہیں ۔یہ تلخ احساس بڑھانے کا موجب بن جاتے ہیں ۔اضطراری حالت میں میرے ہاتھ ان لاتعداد بٹنوں پر پہنچ جاتے ہیں جن پر جہاز کی سلامتی کا انحصار ہے ۔اور جن کا غلط استعمال جہاز کو تباہ کر سکتا ہے ۔

"ہمایوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا ۔

"تم مجھے بزدل بنانا چاہتی ہو رفی! مجھے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے دو ۔کامیابی انہی لوگوں کا مقدر بنتی ہے جو زندگی کو ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں اور موت سے خوفزدہ نہیں ہوتے ۔تم کیوں بھول جاتی ہو؟ کہ تم ایک بہادر ہواباز کی شریک زندگی ہو ۔رفی! ۔خدا کے لئے مجھے مسکراہٹوں کے جلو میں رخصت کیا کرو ۔ان آنسوؤں کو کہیں دُور چھپا دو ۔تمہارے یہ آنسو مجھے پاگل بنا ڈالتے ہیں ۔

لیکن رفعت کچھ بھی تو نہ کہہ سکی ۔ضبط کے باوجود آنسو رخساروں پر پھیل رہے تھے ۔ہمایوں کے سینے سے سَر لگائے وہ سسکیاں بھر رہی تھی ۔دیر تک وہ اس کے بالوں سے کھیلتا ہُوا اُسے سمجھاتا رہا ۔سارا دن گزر گیا ۔فلائٹ کا وقت سات بجے شام تھا ۔پانچ بجے ہمایوں تیار ہو گیا ۔

رفعت دل میں مچلتے ہوئے طوفان کو پوری طرح قابو میں رکھتے ہوئے اُسے تیار ہونے میں مدد دے رہی تھی ۔

ساڑھے پانچ بجے وہ لوگ کار میں ایئر پورٹ روانہ ہو گئے ۔۔۔۔ایئر پورٹ پر پہنچ کر ہمایوں چارج لینے کے لئے چلا گیا ۔۔۔۔اور وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جنگلے کے قریب آ گئی ۔جنگلے کے سہارے کھڑی ہو کر وہ اسی طرف دیکھنے لگی جدھر ہمایوں گیا تھا ۔کوئی بیس منٹ بعد نیلی وردی میں ملبوس وہ دوسرے دو پائیلٹوں کے ہمراہ سامنے سے آتا دکھائی دیا ۔اس کی باوقار شخصیت وردی میں حد درجہ دلکش نظر آ رہی تھی ۔

"وقت ہو رہا ہے رفی ! مجھے اجازت دو" ہمایوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"جائیے !خدا آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے۔"اس نے کچھ فاصلے پر کھڑے دیو پیکر جہاز کو دیکھا۔

"یوں نہیں جان ہمایوں!۔۔۔۔ان احمریں ہونٹوں سے مسکراہٹوں کی بارش برساؤ تا کہ میں اس میں بھیگتا ہوا جاؤں۔۔۔۔۔"رفعت مسکرائی اور یہ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے برسات کی کسی بھیگی بھیگی شام میں افق پر اچانک قوس قزح نمودار ہو جائے۔یا گہرے گہرے بادلوں کی نقاب ہٹا کر چاند مسکرا دے۔

"خدا حافظ" ہمایوں ہاتھ ہلاتا ہوا تیزی سے جہاز کی طرف چلا گیا۔

ساتھی پائیلٹ اس کے انتظار میں باہر کھڑے تھے۔مسافر بیٹھ چکے تھے۔تھوڑی دیر بعد سگنل ہوا۔جہاز کے سٹارٹ ہونے کی آواز سے پورا ائیر پورٹ گونج اٹھا۔پلک جھپکتے میں رن وے پر جہاز تیزی سے دوڑ رہا تھا۔

"معبود حقیقی !میری زندگی تیرے تحفظ میں،میری روح تیری حفاظت میں،تو ہی اب اس کی سلامتی کا نگہبان ہے۔"

سگنل کے قریب پہنچ کر جہاز اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔اور دیکھتے دیکھتے فضا میں کافی بلندی پر پہنچ کر تیزی سے ایک طرف مڑ گیا۔

لاتعداد لوگوں کی نگاہیں جہاز پر جمی تھیں۔۔۔۔وہ اب ایک چھوٹے سے نقطے کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔

رفعت کی نگاہیں اس چھوٹے سے نقطے کو گھور رہی تھیں جس میں اس کی زندگی،اس کا پیار رواں دواں تھا۔

ڈبڈبائی آنکھوں اور بوجھل دل سے وہ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔اسے سمجھ نہ آتی

تھی کہ اس گھر میں جو ہمایوں کے بغیر اسے اجڑا اجڑا محسوس ہوتا تھا۔ کیسے وہ ایک ہفتہ گزار سکے گی۔

باب نمبر:۱۲

چاند کی روپہلی کرنوں نے دھرتی کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔چھم چھم کرتی سیّال کرنیں فضا کو ایک انوکھا حسن اور رعنائی بخش رہی تھیں ستاروں کے نورانی دیئے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔خوش خرام ہواؤں کی سرسراہٹ سیّال نور میں ڈوبی ہوئی موتیے کی بیلوں کو جھنجھوڑ ڈالتی اور فضاؤں میں خوشبوؤں کی مہک اُمنڈ آتی۔اور عطر بیز ہواؤں کے یہ جھونکے خواب گاہ میں آرام کرسی پر نیم دراز رفعت کو اُداس کر جاتے۔رات رنگین تھی.....حسین تھی۔اور اپنے جوبن پر تھی۔

لیکن۔

رفعت کو اس میں کوئی کشش نظر نہ آرہی تھی۔آخر پُر کشش معلوم ہوتی بھی تو کیسے؟ حسین معلوم ہوتی بھی تو کیوں کر؟وہ جس کی قُربت اِن نظاروں میں رنگ بھرتی۔وہ تو لندن میں تھا۔اس کی عدم موجودگی میں تو رقص کرتی بہاروں کا حسن بھی اُسے پھیکا نظر آتا۔

دل اداس تھا۔نکھری نکھری آنکھیں مغموم تھیں۔

جانے اسے یہ کیوں محسوس ہوتا۔کیوں یہ اندیشے اسے گھیرے رہتے کہ یہ ڈھیروں خوشیاں جو اسے مل گئی ہیں۔دائمی نہیں عارضی ہیں۔ہمایوں کا قرب ان اندیشوں کو سُلا ڈالتا۔اس کے شانوں پر سر رکھے وہ ہر چیز فراموش کر دیتی۔اس کی مظبوط بانہوں میں سمٹ کر وہ اس دنیا میں پہنچ جاتی جہاں کوئی غم،کوئی تفکر،کوئی اندیشہ اور کوئی وسوسہ اسے پریشان نہ کر سکتا۔اس کی موجودگی میں اس کی آنکھوں میں دیئے جلتے۔ہونٹوں پر پیاری پیاری مسکراہٹ بکھری ہوتی اور پاؤں رقص کے سے انداز میں اٹھتے۔

لیکن پھر جگمگاتے دیئے بجھ جاتے۔۔۔۔مسکان چھن جاتی۔چہرے پر پھیلی خوشیوں کا رس چوس لیا جاتا۔

اور یہ سب ہمایوں کے فلائٹ پر چلے جانے کی وجہ سے ہوتا۔

ہمایوں کو لندن گئے چھٹا روز تھا۔ایک دو دن میں اس کی آمد متوقع تھی۔اس بار ذہنی اذیت کے علاوہ اسے جسمانی تکلیف بھی رہی تھی۔طبیعت ہر وقت گری گری محسوس ہوتی۔۔۔۔سر کے چکروں نے بے حال کر دیا تھا۔کیپٹن ذوالفقار کی بیگم نے اسے ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے خاصا اصرار کیا لیکن وہ نہ مانی۔

فضا میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔اس نے دریچے سے باہر جھانکا۔شاید آخری سروس کا جہاز تھا۔

بڑھتی خنکی اب اسے اٹھنے پر مجبور کر رہی تھی۔مگر دل اٹھنے پر آمادہ نہ تھا۔یونہی کتنے ہی لمحے گزر گئے۔

"رفی!۔۔۔۔" پیار بھری آواز اسے سنائی دی۔

وہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔تبھی دودھیا ٹیوب جل اٹھی۔ہمایوں سوئچ بورڈ کے پاس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ان نگاہوں میں کتنا پیار تھا۔

کس تیزی سے وہ آگے بڑھی اور کیسے اس کا سر ہمایوں کے سینے سے جا لگا اسے تو کچھ معلوم نہ تھا۔ایک خواب کا سا سماں تھا۔

"رفی!" ہمایوں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اس کا لہجہ بےچین کیفیت کا غماز تھا۔

"میں ٹھیک ہوں ہمایوں!۔۔۔تم یونہی پریشان ہو رہے ہو۔"

"مجھے جھٹلاتی ہو۔جس کی محبت بھری آنکھیں ایک پل میں تمہارے چہرے کی ہر لکیر پڑھ لیتی ہیں۔اپنی آنکھوں کے ان حلقوں کو ذرا دیکھو جو تمہارے تفکر کی چغلی کھا رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں حد درجہ اداسی عود کر آئی تھی۔

"نہیں ہمایوں! ان دنوں بالکل اُداس نہیں ہوئی۔دراصل میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔" اس نے ہمایوں کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

"تم نے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا؟"

"بس یونہی۔"

اگلے دن ہمایوں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے تفصیلی معائنے کے بعد رپورٹ دی۔

" کیپٹن صاحب! گھبرائیے نہیں ۔۔۔۔بیگم ہمایوں امید سے ہیں۔"

خوشی کے بے پایاں احساس سے ہمایوں کے رگ و پے میں بجلیاں سی دوڑ گئیں۔سب سے زیادہ خوشی اسے رفعت کی توجہ منعطف ہو جانے کی تھی۔

اور جب وہ باہر آئی اس کے عارض دہک رہے تھے۔آنکھیں حجاب سے جھکی ہوئی تھیں۔اپنے بازوؤں میں تھامے ہمایوں اسے کار تک لایا۔

ان کی سوچوں کے دھارے اب اپنا رخ قدرے بدل چکے تھے۔گفتگو کا مرکز نیا

مہمان تھا۔بات چیت کا زیادہ حصہ اسی کے گرد گھومتا۔

ہلکی ہلکی خنکی لئے ایک حسین شام میں جب رفعت اور ہمایوں باتوں میں مصروف تھے۔ہمایوں نے اس کی آنکھوں میں پل بھر کے لئے جھانکا۔۔۔مسکرایا۔

"بیگم صاحبہ اب دل مظبوط رکھئے،صاحبزادے اگر ہمارے نقش قدم پر چل نکلے تو۔۔۔۔"

"یہ تم نے کیا کہہ دیا ہے ہمایوں ؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔تمہیں اگر دہکتے شعلوں سے کھیلنا محبوب ہے تو کھیلو۔۔۔۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مستقبل کے بچے بھی اسی منزل کو اپنائیں۔"

"پگلی تم نہیں جانتیں۔پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔چند برسوں تک کرہ ارض پر ایک آزاد نئی اسلامی مملکت پاکستان کے روپ میں ضرور ابھرے گی۔یقیناً ہمارا مسکن وہی ہو گا۔۔۔آنے والا مہمان پاکستان ائیرفورس کا ہیرو بنے گا اور اس کا باپ پاکستانی شہری ہوابازی کا ایک منجھا ہوا پائلٹ متصور ہوگا۔"

"کیا ضروری ہے کہ مستقبل کا بچہ بیٹا ہی ہو بیٹی بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"نہیں ہمیں بیٹے کی ضرورت ہے۔اس وقت انڈین ائیرفورس اور انڈیا ائیر لائنز میں مسلمان ہواباز آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ہم اس قوم کے افراد ہیں جو سروں کر کفن باندھ کر میدان عمل میں اتری تھی۔جن کا ہلالی پرچم سندھ،سپین اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں لہرایا تھا۔آج وہ قوم محکوم بن گئی ہے۔رفی!۔۔۔۔مسلمان اپنی تاریخ کو ایک بار پھر دہرائیں گے۔۔۔۔"ہمایوں فضا میں نگاہیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔

اور رفعت دل ہی دل میں خود کو نفرین کر رہی تھی۔سوچ رہی تھی کم حوصلگی کا ایسا مظاہرہ مجھے زیب نہیں دیتا۔میری ازلی بزدلی ہمایوں کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنی

چاہیے۔مجھے صحیح معنوں میں خدا پر اعتماد رکھنے والی ایک مسلمان عورت بننا چاہیے۔

یہ نومبر کے آخری ایام کی سرد اور تاریک شب تھی۔رفعت اپنے بستر پر گہری نیند سورہی تھی۔جب اچانک گھٹی گھٹی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔۔۔۔اور اس کی آنکھ کھل گئی۔مدھم مدھم روشنی میں وہ والہانہ انداز میں ہمایوں کی طرف بڑھی۔جو دوسرے پلنگ پر محو خواب تھا۔

"ہمایوں!" کہتے ہوئے وہ اس کے خوابیدہ وجود سے چمٹ گئی۔اس کا تنفس تیز تھا۔آنکھیں فرط خوف سے پھٹی جارہی تھیں ہاتھ برف کی طرح سرد تھے۔

ہمایوں ہڑبڑا کر اٹھا۔تیزی سے لپک کر روشنی کی۔۔۔۔اور اس پر نظر پڑتے ہی نیند کا سارا خمار ٹوٹ گیا۔

"رفی! کیا ہوا؟۔۔۔۔"وہ اسے بازوؤں میں تھامتا ہوا بولا۔

" کیا ہوا۔۔۔۔؟تم نے خواب تو نہیں دیکھا رفی!"اس کے دونوں ہاتھوں کو اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر زور سے دبایا۔

لیکن وہ ایک ٹک اُسے دیکھے جارہی تھی۔"رفی!۔۔۔۔"ہمایوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

اپنے ہاتھوں میں ہمایوں کا چہرہ تھامتے ہوئے وہ دل سوز آواز میں بولی۔

"تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے جاؤ گے ہمایوں۔۔۔۔بولو نا، بتاؤ نا۔۔۔۔"اس کی آنکھوں سے گرم گرم چشمے ابل پڑے۔

"پاگل ہوگئی ہو رفی! زندگی اور روح کا رشتہ جیتے جی کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ان توہمات نے کیوں تمہارے دماغ میں گھر کرلیا ہے؟یہ وسوسے کیوں تمہیں اپنا نشانہ بنا رہے ہیں؟انہیں جھٹک کیوں نہیں دیتیں۔۔۔۔"

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے ہمایوں!۔۔۔۔ایسا خواب جس نے میری ہستی کو ہلاڈالا ہے۔"

"خوابوں پر یقین احمقانہ فعل ہے۔خواب دن بھر کے خیالات کا عکس ہوتے ہیں۔"

"خدا کرے یہ خواب بھی محض ایک واہمہ ہی ہو۔۔۔۔ہمایوں تم کل کی فلائٹ پر نہیں جاؤ گے۔نہیں جاؤ گے۔"وہ سسک اٹھی۔

"رفی۔۔۔۔۔موت و زندگی کا کلی اختیار معبود حقیقی کے ہاتھ میں ہے۔انسان بے بس ومجبور ہے۔موت کی ساعت اگر آن پہنچی ہےتو انسانی تدابیر اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکیں گی۔پھر کیا وجہ ہے کہ ہم افسردہ وملول ہوں؟"ہمایوں اسے سمجھاتا رہا۔

اس خیال سے کہ ہمایوں اور زیادہ پریشان نہ ہو۔اس نے آنکھیں بند کرلیں۔کچھ دیر ہمایوں اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر یہ سوچتے ہوئے کہ وہ سوگئی ہے وہ بھی نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

لیکن رفعت کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی؟اس کا دل تو بیٹھا جا رہا تھا۔خواب کا ہولناک منظر اس کے وجود کو جھلسائے دے رہا تھا۔ذہن سلگ رہا تھا۔۔۔۔۔ایک جھٹکے سے وہ اٹھ بیٹھی۔۔۔۔دھیرے دھیرے چلتے باہر آگئی۔۔۔۔قرآن مجید نکالا اور ڈرائنگ روم میں آکر تلاوت کرنے لگی۔

جانے کتنی دیر تک اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔۔۔۔صبح صادق کے آثار دیکھ کر وہ اٹھی۔چائے تیار کی اور خواب گاہ میں آگئی۔ایک عجیب سی خواہش اس کے سینے میں مچلی۔

وہ جھکی اس کے سرد سرد ہونٹ ہمایوں کی صبیح پیشانی پر جم گئے اور اس کے ساتھ ہی

آنکھوں سے آنسوامنڈ آئے۔آنسوؤں کی یورش کچھ اتنی تیز تھی کہ ہمایوں نے تیزی سے سر اوپر اٹھالیا۔

فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔ہمایوں تیار ہو رہا تھا۔اور وہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح گم صم اُسے تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔

غیر معمولی قلبی اضطراب گویا یقین دلا رہا تھا کہ کوئی انوکھی بات ہونے والی ہے۔

بریف کیس اٹھاتے ہوئے ہمایوں نے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔وہ صوفے پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"اف" ہمایوں لرز اٹھا۔دل دھڑک کر رہ گیا۔ایسی کیفیت اس سے پہلے اس پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔وہ اُداس ضرور ہوتی تھی۔لیکن آج وہ کسی ایسے انسان کی طرح نظر آ رہی تھی جو لٹ پٹ گیا ہو۔اس کی آنکھوں سے حسرتیں اور ویرانیاں جھلک رہی تھیں۔تیز تیز سانس لیتا ہوا ہمایوں اپنی جگہ پر کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔دل تیزی سے دھڑکا۔اس کی چھٹی حس بیدار ہوئی۔کسی اندرونی طاقت نے کانوں میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

"آج فلائٹ پر نہ جاؤ۔"

"کیوں؟"

اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک دیا "موت بہادر انسانوں کو کبھی خوف زدہ نہیں کر سکتی۔موت سے فرار بزدلی ہے اور میں بزدل نہیں۔"

"خدا حافظ رفی!" وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

رفعت کے بخ جسم میں جیسے کسی نے برقی قوت بھر دی ہو۔وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور برآمدے کی طرف بھاگی۔۔۔۔ہمایوں کو کار میں بیٹھے دیکھ کر اس کے رہے سہے حواس بھی جواب دے گئے۔وہ تڑپ تڑپ کر چلائی۔

"مت جاؤ ہمایوں واپس لوٹ آؤ۔۔۔۔واپس لوٹ آؤ ہمایوں! کہ تمہاری زندگی نے تمہیں آواز دی ہے۔تمہارے پیار نے تمہیں پکارا ہے۔ہمایوں واپس لوٹو! کہ تمہاری روح بے چین ہے۔

ڈرائیور کار سٹارٹ کر چکا تھا۔رفعت کے دل کو تڑپا دینے والی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔اور اس کے ہوش وخرد اڑاتی چلی گی۔۔۔ہمایوں نے پلٹ کر دیکھا۔آنسوؤں سے تر چہرے پر حزن ویاس کے سائے بکھرے دیکھ کر اس کا دل پھٹنے لگا۔

یہ ہستی اسے کتنی محبوب تھی۔دل چاہا کہ وہ رک جائے۔آج کی فلائٹ ملتوی کر دے۔پتہ نہیں کیسے ائرپورٹ پہنچا۔جہاز میں بیٹھتے ہوئے شدت سے اس کا دل دھڑکا۔جہاز کے انجن بیدار ہوئے اور وہ نیلگوں فضاؤں میں پرواز کر گیا۔

باب نمبر:۱۳

برآمدے کے ستون سے سر ٹکائے آنکھوں میں ویرانیوں کے گھمبیر سائے لئے وہ کس حسرت ویاس سے اس راہ کو تک رہی تھی جس پر اس کی زندگی کے نقش قدم پھیلے ہوئے تھے۔کبھی کبھار کوئی پلکوں میں اٹکا موتی شہابی رخساروں سے پھسلتا ہوا نیچے گر پڑتا۔ایک جنونی کیفیت اس پر طاری تھی۔شبستان خیال میں آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔اُن میں آگ کی سی تمازت تھی۔تناور درختوں کو گرا دینے والی طاقت تھی۔

اندیشوں اور وسوسوں کے سانپ پھنکاریں مارتے ہوئے لہرا رہے تھے۔اور ایک معصوم ذہن ان کے زہر سے بن آئی موت مارا جا رہا تھا۔

لیکن یہ خوف کی انوکھی پرچھائیاں نہ تھی جو بھولے بھٹکے کونوں کھدروں سے نکل کر اس کے دل ودماغ پر پھیل گئی تھیں۔بلکہ یہ پرچھائیں تو اتنی گہری تھی کہ اس میں سے امید کی کوئی ننھی سی کرن بھی گزر کر نہ جا سکتی تھی۔

دن گزر گیا اور شب نے اپنا سیاہ آنچل آکاش کی وسعتوں سے اتار کر زمین پر پھیلا دیا۔جانے اس نے کتنی بار بے قرار ہو کر پلکیں جھپکائیں۔

تین بجے کے قریب وہ ایک خوف ناک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔نگاہیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے گردو پیش کا جائزہ لیا۔اس کی حسین نگاہوں میں تھکن کے گلابی ڈورے نمایاں تھے۔اضطراب کی لہریں موجزن تھیں یکلخت اسے اپنے دل میں نا قابل برداشت ٹیس محسوس ہوئی۔نگاہ بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی پر پڑی۔آنکھیں فرط حیرت سے پوری طرح پھیل گئیں۔دل دھک دھک کر اٹھا۔اس کی انگلی سے ہیرے کی وہ انگوٹھی غائب تھی۔جسے شب عروسی کو ہمایوں نے اس کے ہاتھ میں پہناتے ہوئے کہا تھا۔

"رفی!۔۔۔۔میں نے جانے اسے کتنی چاہتوں اور ارمانوں سے تمہارے لئے پیرس سے خریدا ہے۔یہ میرا پیار ہے۔اس کے حسین رنگوں میں میری دلی تمناؤں کے عکس ہیں۔رفی!۔اسے کبھی خود سے جدا نہ کرنا۔"

اور۔۔۔۔آج انگوٹھی انگلی سے جدا ہوگئی تھی۔

وہ پاگل ہوگئی۔۔۔۔تڑپ کر اٹھی۔۔۔۔اِدھر اُدھر دیکھا۔۔۔۔انگوٹھی بستر پر تھی۔۔۔۔جھپٹ کر اس نے اسے اٹھالیا۔اور ہونٹوں سے لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

عین اسی وقت ہمایوں کا جہاز روم سے پینتالیس میل کے فاصلے پر جل رہا تھا۔

رفعت کے ندیم حیات کی ہڈیاں جانے کہاں کہاں پڑی تھیں۔

اگلی صبح کا سورج قیامت لئے سینۂ چرخ پر نمودار ہوا۔اس کی بیمار اور افسردہ کرنیں جانے کتنے لوگوں کے لئے تباہی و بربادی کا پیغام لے کر آئی تھیں۔

رفعت نے آج فضا میں غیر معمولی ویرانی محسوس کی۔۔۔۔خبریں سننے کے لئے ریڈیو کھولا۔۔۔۔نیوز ریڈر کی بھاری بھرکم آواز گونجی۔

"ہمیں افسوس ہے کہ انڈیا ایئر لائنز کا ایک طیارہ جو لندن کی طرف پرواز کر رہا

تھا۔روم سے پینتالیس میل پرے آگ لگ جانے کے باعث جل کر تباہ ہوگیا۔جہاز کے عملے اور مسافروں میں سے ایک فرد بھی زندہ نہیں بچ سکا۔"

فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔۔۔کرسی پر بیٹھی رفعت کو دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے کائنات کا محور اپنی جگہ سے سرک گیا ہو۔۔۔فلکی اور زمینی نظام تہہ و بالا ہو گیا ہو۔۔۔دماغ میں تیز گردش کا ریلا آیا۔۔۔اور وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔

ملحقہ کوٹھی میں کیپٹن ذوالفقار رہتے تھے۔ریڈیو پر یہ اندوہناک خبر وہ بھی سن چکے تھے۔بیگم کو ساتھ لئے بھاگے بھاگے آئے۔رفعت بے ہوش پلنگ پر لیٹی تھی اور خادمہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔نوکر ڈاکٹر کو بلانے کے لئے جا چکا تھا۔

ڈاکٹر آیا۔معائنے کے بعد اس نے فوری طور پر ہسپتال لے جانے کے لئے کہا۔۔۔۔کیس خطرناک تھا۔

ڈاکٹر اکرم نے خبریں سنیں۔پریشان ہو اٹھے فوراً بمبئی ٹرنک کال کی۔اور جب انہوں نے نام سنا،تیورا کر وہیں گر پڑے۔

خادمہ نے بیگم اکرم کو مطلع کیا۔بھاگی بھاگی کمرے میں آئیں۔شوہر کو یوں بے سدھ پڑے دیکھ کر پاؤں تلے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے۔کورامین دی،خفیف سا ہوش آیا۔۔۔ثریا کو خود پر جھکے دیکھ کر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولے۔۔۔

"ثریا ہم لٹ گئے۔۔۔ہم تباہ ہوگئے۔۔۔آہ!۔۔۔۔ہمارا ہمایوں۔۔۔"

" کیا ہوا ہمایوں کو؟" وہ تڑپ کر چیخیں۔

"ہمایوں کا جہاز کریش ہوگیا ہے۔"

فضا میں دو دردناک چیخیں بلند ہوئیں۔ایک ماں کے ممتا بھرے دل سے اٹھی تھی۔دوسری بھائی کے سینے سے۔قیامت ہی تو ٹوٹ پڑی تھی۔ان کی دلفگار آہیں کمرے کی سنگین دیواروں میں چھید کر رہی تھیں۔

سر دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔آنسوؤں کے سوتے ابل رہے تھے۔دل و دماغ میں طوفان برپا تھے۔غم و آلام کے سیاہ جھکڑ انہیں پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔۔۔۔شاداں و فرحاں چہرے یکلخت دکھوں کے انبار تلے دب گئے تھے۔

"یہ سب کیا ہو گیا ہے؟۔۔۔ایسا کیوں ہوا ہے؟۔۔۔۔"

"رفعت کا کیا حال ہوگا؟"

یہ سوال سب کے ذہنوں میں مچلا۔۔۔۔اور۔۔۔۔ان کی آہوں اور سسکیوں کی شدت میں زیادتی کر گیا۔۔۔۔شام تک یہ لوگ بمبئی پہنچ گئے۔

ان کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔حزن و یاس چہروں سے برس رہا تھا۔خود کو گھسیٹتے ہوئے وہ ہسپتال کے کمرے میں داخل ہوئے۔۔۔۔

وہ بے ہوش تھی۔

ان کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔

ظالم موت تو نے کچھ تو سوچا ہوتا۔اس معصوم ہستی کا کچھ تو خیال کیا ہوتا۔

ڈاکٹر نے انہیں رفعت کی نازک حالت کے متعلق بتایا۔

لیکن انہیں صبر و سکون کہاں تھا؟ وہاں تو آگ جل رہی تھی۔الاؤ بھڑک رہا تھا۔

ہمایوں جان و جگر سے بھی پیارا بیٹا۔۔۔۔خاندان کا روشن چراغ۔گلستان حیات کا نوشگفتہ پھول جس کی مہک سے باغبان ابھی پوری طرح محظوظ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ شاخ سے توڑ کر مسل بھی دیا گیا۔

دل کیسے نہ جلتے؟ کیسے نہ تڑپتے؟

ان کا البیلا شہزادہ ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا۔قلبی سرور لٹ گیا تھا۔۔۔آنکھوں کا نور چھن گیا تھا۔۔۔دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ممتا اجڑ گئی تھی۔۔۔پدرانہ محبت کی الم ناک سسکیاں حشر برپا کر رہی تھیں۔معصوم برادرانہ محبت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے انہیں اس زندگی کا احساس دلایا۔۔۔۔جو بستر مرگ پر پڑی موت کو آواز دے رہی تھی۔جس کے نازک بدن میں ننھا سا ایک اور وجود تخلیق پا رہا تھا۔

بے ہوشی ٹوٹی۔اپنے اوپر جھکے ہوئے تین چہروں کو اس نے دیکھا۔

وہ چہرے جن کی آنکھوں سے ایک ہی غم آشکارا تھا۔

تڑپی۔۔۔اور ثریا کے سینے سے چمٹ گئی۔

اس کی غمگین کراہوں میں تمناؤں کا خون تھا۔المناک سسکیوں میں آرزوؤں کے یوں لٹ پٹ جانے کا درد تھا۔۔۔وہ درد جس سے وہ اچانک ہم کنار ہو گئی تھی۔دماغ کی رگیں پھٹنے کو تھیں۔

یہ جان لیوا احساس کہ وہ ہمایوں کے بغیر کیسے رہ سکے گی؟اسے ڈس رہا تھا اور وہ گھائل ہو ہو کر تڑپ رہی تھی۔

دو دن بعد اسے ہسپتال سے گھر لایا گیا۔۔۔ایک نظر اس نے در و دیوار پر ڈالی۔۔۔دل میں حسرتوں کے طوفان اٹھے۔۔۔اور آنکھوں کی راہ سے باہر نکل آئے۔۔۔آہیں سینے میں تڑپیں۔۔۔اور لبوں پر آ کر دم توڑ گئیں۔

آنسوؤں کے دھندلکے میں اسے وہ گھر نظر آ رہا تھا، جو اس کی جنت تھا۔۔۔جس کی وہ حور تھی۔۔۔

خواب گاہ میں داخل ہوئی ۔۔۔۔سامنے ہمایوں کی تصویر تھی ۔

"ہمایوں!۔۔۔۔ابھی تو حنا کی سرخی میرے ہاتھوں پر باقی ہے۔مستقبل کے سپنوں کی جو تصویریں ہم نے بنائی تھیں ابھی تو ان میں رنگ بھرنا باقی ہے۔۔۔۔ابھی تو جیون تشنہ ہے۔۔۔۔لوٹ آؤ۔۔۔۔کہ رفی تمہارے بغیر مر جائے گی۔۔۔۔مر جائے گی۔۔۔۔"

ثریا بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں ۔اورنگ زیب تڑپ رہا تھا۔ڈاکٹر اکرم کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ رہے تھے ۔

وہ مچل رہی تھی ۔سسک رہی تھی ۔۔۔۔اور تڑپ تڑپ کر ختم ہو رہی تھی ۔

ڈاکٹر کے کہے ہوئے الفاظ ،ڈاکٹر اکرم کے کانوں میں گونجے ۔

''اس کی زندگی تنہا نہیں ۔۔۔۔بلکہ ایک اور وجود بھی تخلیق پا رہا ہے۔۔۔۔ہمایوں کا بچہ ۔۔۔۔ہمایوں کی نشانی ۔۔۔۔ہمایوں ہم سے بچھڑ گیا ہے۔۔۔۔لیکن اس کی یادگار بھی اگر ہم نے گنوا دی تو یہ اور دردناک حادثہ ہو گا۔"

عزم سے آگے بڑھے اور اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے دل سوز لہجے میں بولے ۔۔۔۔

"بیٹے !۔۔۔۔یوں آہ و زاری کرنے اور تڑپنے سے ہمایوں ہمیں واپس نہیں مل سکتا ۔۔۔۔وہ خدا کی امانت تھا ۔۔۔۔اور ہم اس کے امین تھے ۔اسے حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اپنی امانت واپس لے لے اانسان مجبور ہے ۔بے بس ہے ۔"

باب نمبر:۱۴

وقت کے ساز نے کتنا المناک گیت چھیڑ دیا تھا۔جس کی تانوں میں زخمی روح کی پکار تھی۔پیار کی شاہراہ پر چند قدم اٹھانے کے بعد ہی وہ اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں خوشیوں کے درخشاں آفتاب نے اسے ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا تھا۔جہاں سنگلاخ مہیب چٹانیں اس کی پیشوائی کے لئے کھڑی تھیں۔۔۔۔جہاں ہرسُو گھٹا ٹوپ اندھیرے تھے۔۔۔۔آس،امید اور تمنائیں سبھی دم توڑ چکی تھیں۔

ایک اس پر ہی کیا موقوف،ڈاکٹر اکرم کا ہنستا کھیلتا خاندان مسکراہٹوں سے محروم ہو گیا۔جوان پوتے کا غم خدیجہ بیگم کی ناتواں ہڈیوں میں یخ لہر بن کر اترا۔اور انہیں قبر میں گھسیٹ کر لے گیا۔

ڈاکٹر اکرم کے بلند بانگ قہقہے،ان کی زندہ دل شخصیت غم کے گہرے سیاہ بادلوں میں چھپ گئی۔

ثریا بیگم کے روشن چہرے پر دکھوں کے سائے بکھر گئے۔

اورنگ زیب کی شوخی جانے کہاں دفن ہوگئی ۔آنکھوں میں تنہا رہ جانے کے آنسو چمک رہے تھے ۔

شمیمہ اوران کے بچے بھی مردوں سے بدتر تھے ۔

ثریا کا زیادہ وقت عبادت کرنے اور رفعت کو بہلانے میں گزرتا ۔اکثر شام کووہ ہسپتال چلی جاتیں ۔دکھی اور کراہتے مریضوں کے غم سنتیں ۔۔۔۔

تب انہیں احساس ہوتا کہ لوگ کتنے دُکھی ہیں ۔کیسی کیسی جان لیوا بیماریوں میں مبتلا ہیں ۔

دودھیا راتوں میں جب چاندنی زمین پر بکھر جاتی ۔یاسمین کی کلیاں کھِل کر فضا میں خوشبوؤں کے جام انڈھاتیں ۔سرسراتی ہواؤں کے آنچل اٹکھیلیاں کرتے پھرتے ۔اس سے اس کا جنون جاگ اٹھتا ۔ثریا کے سینے میں منہ چھپائے وہ چیخ چیخ اٹھتی ۔

''امی یاسمین کی کلیوں کو روندڈالیئے ۔انہیں مسل دیجئے ۔ان کی خوشبو میں کوئی بسا ہوا ہے ۔یہ مجھے کسی کی یاد دلاتی ہیں ۔

امی گلاب کے اِن سُرخ پھولوں سے کہیئے ،وہ شگوفے ہی رہیں ۔یہ کھلتے ہیں تو ہرسُو آگ بکھر جاتی ہے ۔آگ کو آرزوؤں کو جلا کر بھسم کرڈالتی ہے ۔اِن تیز چلنے والی ہواؤں سے کہہ دوامی ! ۔یہ آہستہ چلیں ۔یہ جب تیز چلتی ہیں تو آشاؤں کے کتنے ہی دیپ بُجھ جاتے ہیں ۔''

غمگین صبحوں اوراداس شاموں کا چکر چلتا رہا ۔اور ایک دن عین اس وقت جب ستارہ سحری تاریکیاں چھٹ جانے کی نوید سنا رہا تھا ۔رفعت نے بیٹے کو جنم دیا ۔بیٹا جو ہمایوں کا عکس تھا اس کی تصویر ۔اُس کے نقوش ۔

اور یہ بچہ اس کے رِستے ہوئے ،زخموں کے لئے کسی حد تک مرہم بن گیا ۔اس کی

مجروح روح کے لئے شانتی کا ذریعہ ہوگیا۔اس کے زخمی دل میں ٹھنڈک کا لطیف احساس بن کر اتر گیا۔۔۔۔وہ گھر جہاں ویرانی تھی۔موت کا سا سکوت مسلط تھا۔ننھے ثاقب کی معصوم کلکاریوں سے وہ گھمبیر سکوت کسی حد تک ٹوٹ گیا۔ان کے حزن آلود چہروں پر اسے دیکھ کر بشاشت دوڑ جاتی۔

موسم ایک دوسرے کے تعاقب میں تیزی سے دوڑتے رہے گھٹنوں کے بل رینگتا وجود منے منے پاؤں چلتا کوٹھی کے برآمدوں اور کمروں کا چکر لگاتا توتلی زبان سے باتیں کرتا اب سکول جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

وہ اسکول چلا جاتا اور رفعت اس کے لئے رسائل میں سے تراشیدہ تصاویر البم میں لگاتی۔ان میں سے بیشتر تصویریں جہازوں کی ہوتیں وہ جو شوہر کی ہوابازی سے خائف تھی۔اب بیٹے کو جہازوں کے متعلق تفصیلات کیسے بہم پہنچانے لگی۔اس کا راز اس خواب میں مضمر تھا جو اس نے اس رات دیکھا جب تین سالہ ثاقب نے جہاز میں بیٹھ کر چاند میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔

بیٹے کی اس معصوم خواہش پر اس کا دل دہل کر رہ گیا۔ذہن کی دیواروں نے زبردست ارتعاش محسوس کیا۔

" کیا زمانہ ماضی کی دردناک تاریخ پھر دہرائے گا۔"

" نہیں،نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔میں اپنے بیٹے کو آگ اور خون کی ہولی نہیں کھیلنے دوں گی۔"

تبھی ہمایوں کی خواہش اس کے کانوں میں گونجی۔

"دل و دماغ میں جنگ شروع ہوگئی۔لیکن اس کی ممتا نے محبوب کی ہر خواہش کو روند ڈالا۔

اور پھر اسی شب اس نے خواب دیکھا۔جانے یہ کیسا خواب تھا۔ہمایوں نے اسے جانے کیا کہا؟چند دن وہ سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا رہی ۔۔۔۔خوابوں میں ہر روز ہمایوں کو دیکھتی ۔۔۔۔

اور پھر خیالات میں عظیم تغیر رونما ہوا۔اب وہ سرما کی طویل راتوں میں ہمایوں کی کہانیاں لخت جگر کو سناتی ۔اسلامی تاریخ کے نامور سپہ سالاروں اور مجاہدوں کی کہانیاں ۔وہ اُس کی تربیت بڑے انوکھے انداز میں کرنا چاہتی تھی ۔

اورنگ زیب کی عصمہ سے منگنی ہو چلی تھی لیکن خاندان کے کبھی افراد رفعت کے متعلق سوچ رہے تھے ۔لمبی پہاڑ سی زندگی کسی سہارے کے بغیر کٹنا کتنی مشکل تھی ۔اور اسی خیال کے پیش نظر کہ رفعت کو اورنگ زیب سے وابستہ کر دیا جائے ۔شمیمہ نے ثریا بیگم سے بات کی ۔

"شمیمہ جس آگ میں وہ جل رہی ہے مجھے اس کی تپش کا بخوبی احساس ہے ۔تنہائیوں کا جان لیوا احساس اس کی روح کو دیمک بن کر چاٹ رہا ہے ۔میں نے اورنگ زیب کے متعلق اس سے بات کی تھی ۔زندگی میں اپنی کسی سنگین ترین غلطی کا میں نے شاید اتنا خمیازہ نہ بھگتا ہو ۔جتنا اس بات سے ۔۔۔۔شمیمہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جنہیں شوہر سے پیار نہیں دیوانگی کی حد تک عشق ہوتا ہے ۔۔۔۔۔اور ہمایوں اس کا شوہر نہیں محبوب تھا نہیں نہیں میں اس کی آنکھوں سے ٹپکتے غم کے آزار کو اور گہرا نہیں کرنا چاہتی ۔میں اس کے چہرے پر پھیلے حزن وملال کے سائے اگر نوچ نہیں سکتی تو مجھے انہیں گہرا کرنے کا بھی کوئی حق حاصل نہیں ۔"

اس کے مثالی پیار سے شمیمہ کب آگاہ نہ تھیں ۔خاموش ہو گئیں ۔فرض کا جو عظیم بار ان کے شانوں پر پڑا تھا اسے بھی ہلکا کرنا تھا ۔

چنانچہ رفعت کی رائے سے اورنگ زیب اور عصمہ کی شادی کی تاریخ مقرر کی گئی۔اور معینہ تاریخ پر باوقار سی سادہ تقریب میں انہیں رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔

عصمہ کا وجود رفعت کے لئے کتنی تقویت کا باعث بنا یہ کوئی رفعت کے دل سے پوچھتا۔عصمہ کو رفعت سے ویسے بھی والہانہ پیار تھا۔اب تو ان کے پیار میں دل کا درد بھی شامل تھا۔۔۔۔ایک سال بعد عصمہ نے بیٹی کو جنم دیا۔

اتنی پیاری۔۔۔۔من موہنی۔۔۔۔یوں جیسے چاند دیس کی کوئی منی سی شہزادی ان کے ہاں اتر آئی ہو۔

ثاقب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔اسے تو ایک خوبصورت کھلونا مل گیا تھا۔

باب نمبر:۱۵

تقسیم کے سوال نے برِصغیر کو فتنہ و فساد کی آگ میں لپیٹ دیا تھا۔آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے۔دھواں دھار تقاریر ہوتیں۔پُر جوش نعرے فضاؤں میں گونجتے۔جلوس نکلتے۔غرض مُلک کی سیاسی فضا بہت مکدر تھی۔مُلک کا بٹوارہ اب ایک ایسی ٹھوس حقیقت بن چکا تھا جس سے کوئی ذی شعور انسان انحراف نہ کر سکتا تھا۔۔۔۔

ثریا بیگم کا خیال پاکستان جانے کا نہیں تھا۔ڈاکٹر اکرم کو بیٹے کا غم لے بیٹھا تھا اور شوہر سے بے پناہ محبت ثریا بیگم کو ہندوستان نہ چھوڑنے پر مجبور کر رہی تھی۔لیکن جانے رفعت کیوں پاکستان جانے کی اتنی خواہشمند تھی۔شمیمہ بیگم کے شوہر اسد علی سات اگست کو ان کے پاس آئے اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس امر پر مجبور کیا کہ وطن چھوڑنے میں ہی ان کی بہتری ہے۔دو تین دن وہ لوگ تیاریوں میں مصروف رہے۔دس اگست کی شب کو ایک فوجی ٹرک آیا۔گھر کا ضروری سامان لادا گیا۔اور گھر کے سب افراد معہ شمیمہ کے خاندان کے ٹرک پر سوار ہو گئے۔

خاموش رات کا سینہ چیرتے ہوئے ٹرک آگے بڑھ رہا تھا۔رات کا کوئی ایک بجا ہوگا۔۔۔فضا میں ایک مہیب آواز پیدا ہوئی ٹرک کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔عورتوں اور بچوں کو اتار دیا گیا۔دھڑکتے دل اور آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں لئے وہ نیچے اتر آئیں۔۔۔رات کی گہری تاریکی دلوں کو اور بھی دہلا رہی تھی۔

دُور فضا میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔اور ان کے سہمے سہمے وجود اور بھی لرز گئے۔۔۔صورت حال اتنی خطرناک تھی کہ کوئی بھی اور کسی بھی وقت ان پر حملہ آور ہوسکتا تھا۔پستول ہاتھوں میں پکڑے مرد اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔عورتوں کو ایک جگہ بٹھا دیا گیا تھا۔۔۔انسپکٹر شیر زماں کسی قریبی گاؤں سے مدد کی تلاش کے لئے نکل گیا۔

فضا میں چند خوف ناک آوازیں چنگھاڑیں۔

"شکار مل گیا ہے چلے آؤ۔"

ان کے دم ساکت ہو گئے۔"خدایا تو ہی ہمارا نگہبان ہے۔ہماری آبرو کا رکھوالا ہے۔"

"آپ کے ساتھ مستورات ہیں۔ان کھیتوں کی طرف بھاگیئے ان کا مقابلہ ہم کرتے ہیں۔۔۔" سپاہیوں نے اسد علی سے درخواست کی۔

سوچنے اور سمجھنے کا سوال ہی نہ تھا۔آسمان کے سینے میں چھید کرتی کرخت آوازیں اب قریب سے سنائی دے رہی تھیں۔دھپ دھپ تیز بھاگتے قدم اب انہیں مزید سوچ بچار کا موقع نہیں دے سکتے تھے۔

اسد علی کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی بھاگ کھڑی ہوئیں۔۔۔پاؤں بے دم ہو رہے تھے۔لیکن خود کو گھسیٹنے پر مجبور تھیں۔۔۔

"دیکھو نکلنے نہ پائیں۔"

اس آواز کے ساتھ ہی انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا تعاقب تیزی سے کیا جا رہا ہے۔فضا میں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائیں دیں۔

ان کے قدموں میں کچھ اور تیزی آ گئی۔ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر وہ بھٹک رہے تھے۔

سنسناتی ہوئی ایک گولی آئی اور رفعت کی پنڈلی کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔خون کا فوارہ چھوٹا۔۔۔۔نا قابل برداشت ٹیس محسوس ہوئی۔

لیکن۔۔۔۔وقت کی نزاکت اسے بھاگنے پر مجبور کر رہی تھی۔وہ تقریباً سب سے پیچھے تھی۔ثاقب کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے وہ بے سدھ بھاگ رہی تھی۔مگر کب تک بھاگتی؟ ہمت جواب دے رہی تھی۔آنکھوں تلے اندھیرا چھایا جا رہا تھا تھوڑا بہت جو نظر آ رہا تھا،خون کے اخراج نے اس سے بھی محروم کر دیا۔اب تو چلنے تک کی سکت نہ تھی۔تیوارا کر گر پڑی۔۔۔۔سہما ہوا ثاقب جس کی آنکھوں میں کچی نیند کا غبار تھا۔چیخ اٹھا۔فوراً رفعت نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔اسے چھاتی سے لگا لیا۔لیکن معصوم بچے کی چیخیں یوں کیسے بند ہو جاتیں۔۔۔۔آخر روتے روتے نقاہت نے غنودگی طاری کر دی۔

صبح کاذب کے وقت اسے قدرے ہوش آیا۔حد درجہ نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔خود پر نگاہ ڈالی۔ثاقب اس کے سینے سے چمٹا گہری نیند سو رہا تھا۔اس کا آدھا وجود نالے کے اندر اور آدھا باہر تھا۔

''اف!میرے گھر والے کہاں ہیں؟''اس نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔۔۔۔یہ ایک ایسا کربناک احساس تھا۔جس نے اس کے ناتواں بدن میں بجلی کی سی تیز لہر دوڑا دی۔اس نے جلدی سے ثاقب کو اٹھایا اور چلنا چاہا۔۔۔۔مگر وہ تڑپ اٹھی۔۔۔۔داہنی ٹانگ میں اتنی شدید تکلیف محسوس ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ

نکلے۔ ''امی !اورنگ زیب،عصمہ تم سب کہاں ہو؟ کہاں ہو؟ میں تمہیں کہاں تلاش کروں؟سر کو گھٹنوں میں دیئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مصائب کی آندھیاں ایک بار پھر گھٹا ٹوپ اندھیرے لئے اسے نرغے میں لے چکی تھیں۔

مہیب اندھیرے۔۔۔۔جو اس کا مقدر بن گئے تھے۔جنہوں نے اس کی خوشیوں کو نگل لیا تھا۔

دھیمی دھیمی آواز میں اس نے انہیں ایک بار پھر پکارا۔لیکن کسی پکار کا جواب نہ ملا جو نا امیدی کو کم کر سکتا۔مٹی کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے اس نے بے اختیار سوچا۔۔۔۔

" کہیں تقدیریں بھی بدلتی ہیں۔۔۔۔کہیں نصیب بھی بدلے ہیں۔شوہر چھن گیا۔۔۔۔زندگی بکھر گئی۔۔۔۔گھر چھنا۔۔۔۔اور گھر والے بھی بچھڑ گئے۔۔۔۔یہ گولیاں جنہوں نے میری پنڈلی زخمی کر دی ہے کاش!۔۔۔۔میرے دل میں لگتیں۔۔۔۔اور مجھے ابدی نیند سلا دیتیں۔یہ تلخ حادثے جو قدم قدم پر میرا استقبال کرنے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔۔۔۔ان سے تو نجات مل جاتی۔۔۔۔"

گلابی گلابی اجالا پھیل رہا تھا۔۔۔۔اس کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔۔۔۔آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے۔ذہن مفلوج ہو رہا تھا۔ابھی اگر کوئی اس طرف آنکلا تو جانے اس کا کیا حشر ہو۔

سوچی سوچی آنکھوں سے اس نے ثاقب کو دیکھا جو ابھی تک سو رہا تھا۔شاید اگر وہ تنہا ہوتی تو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی لیکن ممتا نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔

اس کا ثاقب،اس کا ہمایوں باپ کے ساتھ ساتھ ماں سے بھی محروم ہو جائے۔یہ اسے گوارا نہ تھا۔

"نہیں،نہیں میں حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گی۔"

وہ اٹھی اور گنوں کے کھیت میں چھپ گئی۔جس کے مارے اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔لیکن وہ وہاں پناہ لینے پر مجبور تھی ۔۔۔۔ننھے ثاقب نے گرمی سے بے چین ہو کر آنکھیں کھولیں۔سورج نکل آیا تھا۔اس کی آتشیں کرنیں اور تپتی زمین اسے اور ننھے ثاقب کو بے چین کیئے دے رہی تھی ۔۔۔۔۔وہ اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"خدایا زمانے بھر کی محرومیاں اور بدنصیبیاں کیا میرے مقدر میں ہی لکھ دی ہیں؟"

اسے اپنی تکلیف کا کوتو رتی بھر احساس نہ تھا لیکن اپنے لختِ جگر جسے آسائشوں کو گود میں پروان چڑھایا گیا تھا،کے اضطراب پر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی ۔۔۔۔اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں ۔۔۔۔پھر سرسراہٹ تیز ہوتی گئی۔

"خدایا!"اس کا دل دھڑکا۔

ثاقب کے منہ پر اس نے ہاتھ رکھ دیا اور دم روکے نئے حادثے کا انتظار کرنے لگی۔

گھٹی گھٹی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔جب اس نے اپنے سے کچھ پرے ایک عورت کو بیٹھے پایا ۔۔۔۔جو گھاس کاٹ رہی تھی ۔۔۔۔چیخ سُن کر وہ قریب آئی۔حسین و جمیل اکیس بائیس سالہ ایک عورت کو خوب صورت بچے کے ساتھ اضطرابی حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔

" کون ہو تم ؟"اس نے پوچھا۔

ایک ٹک رفعت اسے دیکھے جا رہی تھی ۔۔۔۔پتہ نہیں وہ ہندو ہے،مسلمان ہے،یا سکھ،کیا کہوں ۔۔۔۔اُس نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بغیر کسی خوف

کے بولی۔

"ایک مصیبت کی ماری عورت۔۔۔۔تم دیکھ رہی ہو۔''

گھسیارن کے چہرے پر دکھ کا گہرا احساس نمودار ہوا۔ ہے بیچاری کتنی خوبصورت کتنی معصوم۔کسی اچھے گھر کی سوانی لمبی سی آ کلیجے سے نکالی۔رفعت نے مختصر لفظوں میں اپنی داستان غم اسے سناڈالی۔

میری بہن اس نواحی گاؤں میں ہندو اور سکھوں کی اکثریت ہے تمہیں ابھی اپنے ساتھ لے جانا خطرے سے خالی نہیں۔آج کا دن اسی جگہ گزار، رات ڈھلتے ہی میں تمہیں لے جاؤں گی۔۔۔۔تھوڑی دیر بعد میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے آتی ہوں۔

وہ دن تھا یا قیامت۔۔۔۔بارہ گھنٹے کا وہ قیامت خیز دن اسے اپنی اکیس سالہ زندگی پر حاوی نظر آ رہا تھا۔۔۔۔جانے کتنی بار وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔۔۔۔اور کتنی بار معصوم بچہ گرمی سے بلبلا کر تڑپا۔

رات آئی اور وہ اس نیک دل عورت کے ساتھ اُس کے گھر آ گئی۔۔۔۔اس کے خاوند نے چپکے چپکے اس کے عزیزوں کو کھوج لگانا چاہا لیکن اس کی کوشش بار آور نہ ہو سکی۔

تین چار دن تک اُن لوگوں کی جانیں سولی پر ٹنگی رہیں۔۔۔۔بالآخر عورت کا مرد اُسے پاکستان جانے والے ایک قافلے میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔چودہ اگست کا سورج طلوع ہوا آزادی کا سورج۔

اس کی زبوں حالی کے پیش نظر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی رفعت ہے۔۔۔۔آہ نیرنگئی زمانہ۔

موٹی چادر میں لپٹی وہ چل کہاں رہی تھی؟ خود کو بمشکل گھسیٹ رہی تھی۔اسپیشل ٹرینوں میں لوگ جانوروں کی طرح لدے ہوئے تھے۔جانے کیسے اس میں اتنی دلیری

آ گئی ۔لوگوں کو چیرتی ہوئی وہ گاڑی میں سوار ہوگئی ۔

گاڑی پاکستان کی حدود میں داخل ہوئی ۔آزاد مملک کے آزاد شہر لاہور میں وہ اُتری ۔پژمردہ چہرے ،نڈھال آنکھوں سے اس نے پلیٹ فارم کی طرف دیکھا۔۔۔اپنے بیٹے پر نگاہ ڈالی ۔۔۔دل کٹ سا گیا ۔اس کے شگفتہ پھول کو بادِ سموم نے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

یہ آزادی کتنی مہنگی تھی ۔وہ گھر سے بے گھر ہوگئی ۔عزیزوں اور چاہنے والوں سے بچھڑ گئی ۔آج اس وسیع وعریض کائنات میں کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔

بے سہارا ۔بے یارومددگار۔۔۔۔

لیکن وہ جی رہی تھی ۔۔۔۔دکھوں کے انبار اٹھائے جئے جارہی تھی ۔

باب نمبر:١٦

غم و آلام کے بادلوں کی دبیز تہیں مطلع حیات کو اچھی طرح لپیٹ میں لے چکی تھیں۔

وقت اُسے اجالوں کے دیس سے۔۔۔چاہنے والوں کے وطن سے۔۔۔محبت کے شہر سے۔۔۔گھسیٹ کر کہاں لے آیا تھا؟ کن اندھیری شاہراہوں پر ڈال گیا تھا۔۔۔پھر بھی ان تاریک راہوں پر ایک قندیل پوری آب و تاب سے روشن تھی۔

یہ قندیل۔۔۔اس کے ٹھوکریں کھاتے قدموں کو روشنی دکھاتی لوگوں کی سنی آنکھوں،غم آلود چہروں،بکھرے بالوں اور بوسیدہ کپڑوں پر نگاہیں پڑتیں۔تو سینے سے ہوک سی اٹھتی۔

دیکھو تو یہ لوگ بھی تو ہیں۔وہ خود کو دلاسا دیتی۔شکر ہے میرا بیٹا میرے پاس ہے۔

لمحات کے اس دکھی چکر میں اس کی نظریں فرش پر سوئے ثاقب پر پڑتیں۔تب اس کی ممتا تڑپ اٹھتی۔اسے بازوؤں میں سمیٹے وہ اس مستقبل کا تصور کرتی جب اس کی صبیح پیشانی والا بیٹا جوان ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہو گا۔اس سے اس کے سارے دکھی احساسات ختم ہو جاتے۔۔۔۔اور اپنے لختِ جگر کے لئے زندہ رہنے کی تمنا دل میں موجزن ہو جاتی۔

جھک کر اس نے بیٹے کی پیشانی چومی۔پیشانی جل رہی تھی صبح سے اسے بخار تھا۔لیکن اب بخار کی شدت میں تیزی آ گئی تھی۔اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کیمپ عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔کسے اپنی المناک داستان سنائے۔یہاں تو سبھی دکھی اور لٹے پٹے ہیں۔

ہر ایک کے سینے میں جلتی کہانیاں دفن ہیں۔۔۔۔ہر ایک کی آنکھوں میں مچلتے آنسو ہیں۔۔۔۔

اس کے آنسوؤں کی کیا حقیقت؟اس کی المناک داستان کی کیا اہمیت؟یہاں پیٹ کی آگ بمشکل بجھتی ہے۔اس کا بیٹا جس آگ میں جل رہا ہے اسے کون بجھائے گا۔

کیمپ کے ایک دو ذمہ دار مردوں سے اس نے بات کی۔لیکن کسے پرواہ تھی۔انسان مر رہے تھے۔۔۔۔تڑپ رہے تھے۔

دوپہر تک بخار میں اور بھی تیزی آ گئی۔

بیٹے کی حالت دیکھ کر وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ننھے ثاقب کو گود میں اٹھائے وہ دیوانہ وار انچارج کے کمرے میں گئی۔۔۔۔آہوں اور سسکیوں کے درمیان ساری بات اسے سنائی۔انچارج کے پاس ایک میجر صاحب بھی بیٹھے تھے۔اس کی دردناک کہانی پر دونوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔۔یہ جاننے پر کہ وہ گریجویٹ ہے میجر نے اپنی بہن کے بچوں کو پڑھانے کی پیش کش کی تا کہ اس کی رہائش وطعام کا آبرومندانہ انتظام کیا جا سکے۔

موجودہ حالات میں ایک ایسی جگہ کا حصول اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ شام کو وہ میجر کی کار میں نئی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میجر کی بہن بھی اپنے بھائی کی طرح ملنسار اور با اخلاق خاتون تھیں۔ اس کی شکل وصورت، شائستگی اور ہاتھوں میں پڑی ہیرے کی انگوٹھی سے وہ بہت کچھ جان چکی تھیں۔

"سلطان ولا۔" کے ایک خوبصورت کمرے نے اس کی رہائش کا مسئلہ بخوبی حل کر دیا۔ مسٹر سلطان بہت بڑے تاجر تھے۔ جب اس نے پہلی مرتبہ انہیں دیکھا تو جانے کیوں وہ اسے اچھے نہ لگے۔ چہرے سے ٹپکتی رعونت اور نظروں میں حریصانہ چمک نے اسے کسی حد تک خوف زدہ کر دیا۔

لیکن سیٹھ سلطان بہت کم نظر آتے۔

زندگی کے سمندر میں اٹھتی ہوئی تلاطم خیز موجوں میں قدرے کمی آ گئی تھی۔

اس کے وقت کا کچھ حصہ مسز سلطان کے بچوں کی تدریس میں گزر جاتا۔ اور بقیہ وقت وہ ثاقب کی تربیت پر صرف کرتی۔۔۔۔ وہ بیٹے کو ایک درخشاں و تاباں مستقبل کا مالک بنانا چاہتی تھی۔ جانے یہ اس خواب کا اثر تھا یا حد درجہ مصائب تھے یا محبوب کی خواہش کی تکمیل پیش نظر تھی۔ جس نے اس نازک اور معصوم لڑکی کے ذہن کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔

وقت انسانی اذہان کو کن کن سانچوں میں ڈھال دیتا ہے۔ میجر صاحب اور مسز سلطان کی کوشش بسیار کے باوجود اس کے عزیزوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

ایک مبہم سی آس تھی، اب تو وہ بھی دم توڑتی نظر آ رہی تھی۔ ویسے وہ حالات سے سمجھوتہ کر چکی تھی۔ جان گئی تھی کہ محرومیاں اس کا مقدر رہیں۔ اور مقدر کو بدلنا اس کے بس کا روگ نہیں۔

ایک دن شام کے وقت رفعت پائیں باغ میں بچوں کو پڑھانے میں منہمک تھی

کہ سلطان صاحب کی آمد سے چونک اٹھی۔ان کی گرسنہ نگاہیں اس کے جسم میں نفرت کی بجلی سی دوڑا گئیں۔۔۔۔کرسی گھسیٹ کر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئے۔اس کی بیزاری ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔۔۔۔مگر شاطر کھلاڑی تھے۔کچھ دیر بعد براہ راست اس سے مخاطب ہوئے۔

"رفعت!۔۔۔آپ نے اپنے گرد محرومیوں کا جو جال بُن لیا ہے۔اسے توڑ ڈالیے۔۔۔۔زندگی دکھوں کو گلے کا ہار بنا لینے کا نام نہیں۔"

"سلطان صاحب!یہ جال خود ساختہ نہیں۔یہ تو مقدر کا وہ عطیہ ہے جس نے زندگی کی ہر خوشی کا احساس چھین ڈالا ہے۔"اس نے متانت سے بھرپور لہجے میں کہا

"آپ جوان اور حسین ہیں۔۔۔۔کیا زندگی کی رنگینیوں میں ڈوب جانے کو آپ کا جی نہیں چاہتا۔۔۔یقیناً آپ کے سینے میں جذبات مچلتے ہوں گے۔لیکن آپ انہیں دبا ڈالنے پر مجبور ہیں۔۔۔۔یہ غم اکیلے نہ برداشت کیجئے رفعت!۔۔۔اس میں کسی کو شریک کرلیں۔"

نفرت کی آگ شعلوں میں تبدیل ہوگئی تھی۔ان شعلوں میں جن کی تیز لپیٹیں اس کے سارے وجود کو جلا گئی تھیں۔۔۔۔

لیکن وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے ٹھہری ٹھہری شکستہ آواز میں گویا ہوئی۔۔۔۔

"سلطان صاحب آپ کی ہمدردیوں کا شکریہ۔۔۔۔میرے لئے چاک دامن کو رفو کرنا ممکن نہیں۔۔۔۔میرے سینے میں جذبات کہاں؟میں تو ایک ایسا پتھر ہوں جس پر جیون کی کوئی رنگینی اثر انداز نہیں ہوسکتی۔زیست کا یہ سلسلہ کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔اگر ثاقب کے ہاتھ میں میرا آنچل نہ ہوتا۔آپ کے مشوروں کا شکریہ۔۔۔۔مگر ایسے مشورے مجھے آپ کی جانب سے آئندہ کبھی نہیں ملنے چاہئیں۔"

عین اسی وقت نوکر چائے لے آیا۔

وہ کھڑی ہوگئی۔

وار اوچھا پڑا تھا۔سلطان صاحب کو اپنی جلد بازی کا احساس ہو چکا تھا۔تیزی سے بولے۔

"مجھے افسوس ہے رفعت میری گفتگو سے آپ کو تکلیف پہنچی۔میرا مقصد آپ کے جذبات مجروح کرنا ہرگز نہ تھا۔مجھے معاف کردیجئے۔۔۔۔"

" کوئی بات نہیں سلطان صاحب!سر راہ پڑے پتھروں کو ہر کوئی ٹھوکر لگا جاتا ہے۔۔۔۔"اس نے چوٹ کی۔

''آپ کو تکلیف ہوگی۔۔۔۔لیکن کیا آپ میرے لئے چائے بنائیں گی۔۔۔۔"

دل چاہا چائے دانی اٹھا کران کے منہ پر دے مارے۔

لیکن وہ کتنی بے بس تھی؟کس قدر مجبور تھی؟زخمی نگاہ اس نے چائے کی ٹرے پر ڈالی۔سوئیوں جیسی چبھن لئے اذیت ناک ٹیسیں اٹھیں۔۔۔۔بوجھل دل اور روح کے ساتھ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔دل کے گہرے گھاؤ تڑپے اور آبی لہر بن کر اس کی نیلگوں آنکھوں میں پھیل گئے۔

چائے بنا کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔۔۔۔اور گردش تقدیر پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔لیکن رونے سے اگر اس کے مسائل حل ہو سکتے تو۔شاید وہ اتنا روتی کہ اس کا سارا وجود اشکوں کے دریا میں بہہ جاتا۔

اب وہ اس گھر کو چھوڑ دینا چاہتی تھی۔لیکن جائے کہاں؟

یہاں تو ایک سلطان صاحب کی بے باک نگاہوں کا سامنا تھا اور باہر ہزاروں

سلطان تلوار سے تیز نگاہیں لئے حسین سراپوں کے منتظر تھے۔

وہ اخبارات میں ضرورت روزگار کا کالم باقاعدگی سے پڑھا کرتی۔اور آخر ایک دن اس کی دلی مراد بر آئی۔منٹگمری کے ایک گرلز سکول کے لئے ٹیچر درکار تھیں۔

اس نے اخبار میں سے اشتہار کاٹ لیا۔

مسز سلطان کے بھائی کی شادی تھی۔۔۔دو دن بعد وہ ان کے ساتھ کراچی جا رہی تھی۔واپسی پر اس کا ارادہ چلے جانے کا تھا۔

سہ پہر کے وقت ثاقب سو کر اٹھا۔تو اس کا بدن تپ رہا تھا۔وہ بے قرار ہو اٹھی۔مسز سلطان نے ڈاکٹر کو بلوایا۔ڈاکٹر نے مکمل آرام کے لئے کہا۔

حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مسز سلطان کو تنہا جانا پڑا۔

اگلی شام ثاقب کا بخار کم ہو چکا تھا۔اور وہ سکون کی نیند سو رہا تھا۔۔۔سوا آٹھ بجے کے قریب خادمہ نے اسے مسز سلطان کا فون سننے کے لئے کہا۔فون سلطان احمد کے ذاتی کمرے میں تھا۔لیکن چونکہ وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔اس لئے وہ مطمئن ہو کر کمرے کی طرف چل دی۔فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔تیزی سے بغیر کسی طرف دیکھے فون کی طرف بھاگی۔

مسز سلطان اس سے ثاقب کے متعلق دریافت کر رہی تھیں۔اور پھر ریسیور کریڈل میں رکھ کر واپس جانے کے لئے مڑی۔

لیکن۔۔۔خوف کی تیز سنسناتی لہر اس کے سر سے لے کر پاؤں تک دوڑ گئی۔۔۔قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔۔۔آنکھوں میں خوف وہراس امنڈ آیا۔

دروازے میں مسٹر سلطان احمد ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل اور دوسرے میں بریف کیس پکڑے اسے گھور رہے تھے۔نگاہوں سے وحشت اور درندگی ٹپک رہی تھی۔ہوس

کے جذبے موجزن تھے۔وہ دروازہ جس سے وہ داخل ہوئی تھی۔بند ہو رہا تھا۔

"ملکوتی حُسن کی ساحرہ آگے بڑھو اور اپنے ان لعلیں لبوں سے میری جلتی ہوئی آتما کو آب زلال پلاؤ۔میرے سینے میں بھڑکتی آگ تمہارے قرب کی متمنی ہے رفعت!۔۔۔آج میرے وہ دہکتے جذبات شبنم کے قطروں میں بدل جانے چاہئیں۔۔۔جنہوں نے میرا ذہن اور دماغ جلا ڈالا ہے۔۔۔آؤ آج ساقی بن جاؤ۔۔۔آگے بڑھو۔۔۔۔"

حواس کو مجتمع کرتے ہوئے اس نے بے اختیار کھڑکی کی طرف دیکھا۔جس پر تنا پردہ قدرے سرکا ہوا تھا۔۔۔باہر فطرت نور کے اجالے انسانوں پر نچھاور کر رہی تھی۔۔۔اور اندر انسان فطری پاکیزگی کے نور کو نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آسمانوں کی حسین دنیا میں رہنے والے خدا۔۔۔چاند تاروں کی دنیا کے خدا۔۔۔انسانوں کی شہ رگ میں بسنے والے خدا!تو نے میری روح کو اس وقت غموں سے آشنا کیا جب مسکراہٹ سورج کی کسی معصوم کرن کی طرح میرے لبوں پر جگمگائی تھی تو نے اس مسکراہٹ کو چھین لیا۔۔۔لیکن میں نے ایک بار بھی تجھ سے گلہ نہ کیا۔

میری زخمی روح پر غموں کے بھرپور چرکے لگائے گئے۔لیکن میں نے فریاد نہ کی۔۔۔خوشیاں مجھ سے چھن گئیں۔۔۔۔بد نصیبیوں کے حصار نے مجھے اپنے حلقے میں گھیر لیا۔

آرزوؤں کے خواب چکنا چور ہو گئے۔۔۔لیکن۔۔۔میں نے اپنے لبوں کو سی لیا۔

اور۔۔۔آج جب میں لٹی پٹی شاہراہ حیات پر روح کو تڑپا دینے والے المیہ نغموں کے جلو میں آگے بڑھ رہی ہوں تو تُو میری عزت بھی لوٹنا چاہتا ہے۔

آج۔۔۔اگر میں لٹ گئی۔۔۔میری پاکیزگی اور تقدس کو کسی نے اپنی ہوس کا نشانہ بنالیا۔۔۔تو یا درکھ میں تیری۔۔۔وحدانیت سے منکر ہو جاؤں گی۔۔۔سوچ تو سہی تُو نے میرے پاس کیا چھوڑا؟

ایک عزت۔۔۔

اور اب وہ بھی چھین لینا چاہتا ہے۔"

وہ خوف، وہ ہراس، وہ آنکھوں میں امنڈتی بے بسی کی کیفیات سب پل بھر میں ختم ہو گئیں۔آنکھوں میں شعلوں کی لپک ابھری۔اور اس سے اسے یوں محسوس ہوا جیسے نور کے اجالے اُسے اپنی پناہ میں لے چکے ہوں۔

"میں تہی دست ہوں۔۔۔تہی دامن ہوں۔۔۔لیکن میرے پاس ایک پارس پتھر ہے۔وہ ہے میری عصمت، جس پر مجھے فخر ہے۔۔۔"

اس کے چہرے پر چٹانوں جیسی سختی ابھر آئی۔

''قریب آؤ نا میری جان!۔۔۔''سلطان احمد نے ایک قدم آگے بڑھایا۔۔۔وہ پیچھے کی طرف سرکنے لگی۔سلطان احمد آنکھوں میں سانپ کی سی چمک لئے دھیرے دھیرے شکار کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اچانک اس کا ہاتھ الماری سے ٹکرایا۔تیزی سے اس نے کوئی چیز نکالنے کے لئے پٹ کھولا۔۔۔سامنے پستول تھا۔سرعت سے پستول ہاتھ میں پکڑ کر وہ اس کا رخ سلطان احمد کی طرف کر چکی تھی۔

"ہاہاہا!"شیطانی قہقہہ فضا میں اچھلا۔

"یہ سبک اور نازک ہاتھ پستول چلا سکتے ہیں۔"

"سلطان صاحب! آپ بھول رہے ہیں۔۔۔یہ گوشت پوست کے نسوانی ہاتھ

ضرور ہیں لیکن ایک عورت کی عزت کو جب للکارا جاتا ہے۔تو یہ سبک ہاتھ فولاد بن جاتے ہیں۔۔۔۔اور آپ جیسے ننگ انسانیت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے سیٹھ سلطان کی ٹانگ کا نشانہ لیتے ہوئے پستول کی لبلبی دبا دی۔گولی ان کی ٹانگ کو چیرتی ہوئی میز سے جا ٹکرائی۔سیٹھ سلطان نے ایک لمبی آہ بھری۔۔۔۔اور میز کے کنارے کو پکڑ لیا۔پستول ہاتھ میں پکڑے پکڑے اس نے دروازہ کھولا باہر سے بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

تیزی سے اپنے کپڑے سمیٹے۔سوتے ہوئے ثاقب کو گود میں اٹھایا اور انجانی رات کی تاریکی میں، کسی انجانی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔

باب نمبر: ۱۷

میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹا ہوا اس کا نازک وجود آنکھوں اور چہرے پر ویرانیاں لئے کمرے کے جائزے میں مصروف تھا۔ شاخ ہستی کا نو شگفتہ پھول ماں کے مقدر کی طرح لو کے تھپیڑوں سے جھلس سا گیا تھا۔ نقاہت کے اثر سے اس وقت ماں کے شانے سے سر ٹکائے آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔

درمیانی عمر کا ایک بھاری بھرکم آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ لمبی دفتری میز کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ناقدانہ نگاہ خاتون پر ڈالی۔ گفتگو ہوئی۔ اس کا شستہ انگریزی کا تلفظ اور مدلل انداز گفتگو خاصا متاثر کن تھا۔ اس کے لہجے میں بے چارگی نہیں تھی۔ بے بسی نہیں تھی۔۔۔۔ بلکہ عزم کی جھنکار تھی۔۔۔۔ اپنے متعلق اس نے صرف اتنا بتایا کہ وہ تقسیم کے وقت اپنے خاندان سے بچھڑ گئی ہے۔۔۔۔ لوگوں کو اپنی تلخ داستان سنا کر کھوکھلی ہمدردیاں حاصل کرنے سے اسے سخت نفرت ہو گئی تھی۔

سکول کا ایک کمرہ اسے رہائش کے لئے مل گیا۔ اور اس کی زندگی اداسی میں ڈوبی

شام کی طرح نئے راستے پر بڑھنے لگی۔

کبھی کبھی جب وہ مینیجر کی گہری گہری نگاہوں کو اپنے چہرے پر مرکوز پاتی تو اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ نئے نئے اندیشے ایک بار پھر اسے اپنی زد میں لے لیتے۔ تاہم وہ صبر سے حالات کا جائزہ لیئے جا رہی تھی۔ اکثر شام کو مینیجر اپنی بیگم کے ہمراہ اس کے پاس آتے۔ ان کی بیگم خاصی خوش طبع اور با اخلاق خاتون تھیں۔ اس سے بہت محبت اور پیار سے ملتیں۔

اس کی صلاحیتوں کے پیش نظر اب سکول کے بہت سے کاموں کی ذمہ داری بھی اسے سونپ دی گئی تھی۔ جہاں تک فرائض کی ادائیگی کا تعلق تھا۔ وہ ہر کام کو خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے سرانجام دیتی۔

عید الفطر کی آمد آمد تھی۔ کافی دنوں سے وہ بازار جانے کے لئے سوچ رہی تھی۔ اس عید پر وہ ثاقب کے لئے بہترین کپڑے خریدنا چاہتی تھی۔ اس کے بیٹے نے تقریری اور تحریری مقابلوں میں ڈپٹی کمشنر سے ایک سو روپے کا خصوصی انعام حاصل کیا تھا۔

ثاقب اس وقت کھیلنے کیلئے باہر گیا ہوا تھا۔

کمرے کو اس نے جلدی جلدی صاف کیا۔ اس چھوٹے سے کمرے کو اسے دن میں دس مرتبہ صاف کرنا پڑتا۔ ثاقب حد درجہ شریر واقع ہوا تھا۔ شوخ، نٹ کھٹ، سیماب کی طرح مضطرب۔۔۔ ایک پل میں کمرے میں قیامت لے آتا۔ کھلکھلا کر ہنستا تو اس سے رفعت کو یوں محسوس ہوتا جیسے دنیا میں اسے کوئی غم نہیں۔۔۔۔

"ثاقب!۔۔۔"

کسی نے پکارا۔

اور یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ وہ آواز کس کی تھی۔

باہر آئی۔ شیخ صاحب ہاتھوں میں پیکٹ لئے کھڑے تھے۔

"آیئے!" اس نے شستہ لہجے میں کہا۔

اور شیخ صاحب اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلے آئے۔

"آپا جان آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟۔۔۔۔" وہ پنکھے کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

"وہ لوگ آج صبح والدہ کے پاس گاؤں چلے گئے ہیں۔شاید عید کے بعد آئیں۔"

تبھی ثاقب آ گیا۔اسے پیار کرتے ہوئے شیخ صاحب نے پیکٹ تھماتے ہوئے کہا۔

"بیٹے !یہ تمہارے اور تمہاری امی کے لئے میری طرف سے عید کا تحفہ ہے۔"

"شیخ صاحب احسانات کے بار سے میری گردن اس حد تک نہ جھکایئے کہ میں اٹھا بھی نہ سکوں۔آپ کی نوازشات پہلے ہی کیا کم ہیں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔۔۔۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔اف!۔۔۔۔وہ لرز اٹھی۔۔۔۔ان نگاہوں کی مخصوص چمک دیکھ کر۔۔۔۔اس کا رواں رواں کانپ گیا۔

"آہ!انسانوں کے روپ میں یہ بھیڑیئے جنہیں کسی کی مجبوریوں کا کوئی احساس نہیں۔"

تھوڑی دیر تک وہ اس سے باتیں کرتے رہے۔اور وہ کھوئی کھوئی سی بے ربط جواب دیتی رہی۔ان کے جانے کے بعد اس نے پیکٹ کھولا اس کے لئے ایک خوبصورت ساڑھی تھی اور ثاقب کے لئے کپڑے تھے۔دل چاہا اس ساڑھی کو چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔۔۔۔ان کپڑوں کو تار تار کر دے۔

یہ عطیات، یہ تحفے ایک مرد کی جانب سے کسی بے بس اور بے سہارا عورت کو

التفات کی یہ پیشکش ،خطرے کی ایک کھلی علامت نہیں تو اور کیا تھی ۔شیطانی اغراض پس پردہ کام نہیں کر رہی تھیں تو اور کیا تھا۔

کپڑوں پر ہاتھ رکھے اس کا ذہن کہاں کہاں بھٹک رہا تھا؟ اسے اس جگہ سے چلے جانا چاہیے ۔چلے جانا چاہیے ۔

لیکن کہاں؟

اور یہ " کہاں "ایک ایسا خوفناک سوال تھا ۔جس نے اس کے ذہن کی دیواریں ہلا ڈالیں ۔اتنے بڑے پاکستان میں اس کے لئے ایک چھوٹا سا گوشہ عافیت بھی نہ تھا ۔ان سات آٹھ کروڑ انسانوں میں ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو اس کی عزت و ناموس کے لئے سینہ سپر ہوسکتا ۔محبت و شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ سکتا۔۔۔۔

خدا کے دیئے ہوئے زخم تو کاری تھے ہی لیکن انسانوں کے عطا کردہ زخموں کی چبھن ان سے کہیں زیادہ تھی ۔

ثاقب پریشان نظروں سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالے اداسی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔

ایک ثانیہ اس نے ان آنکھوں میں جھانکا اس معصوم چہرے کو دیکھا جس پر ثاقب نہیں ہمایوں کا گمان ہوتا تھا۔

"امی آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ ۔۔۔اپنے ثاقب کو نہیں بتائیں گی؟۔۔۔"

اس نے ثاقب کو بازوؤں میں سمیٹ لیا ۔اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عزم کی چمک پیدا ہوئی ۔

"میں ان ہاتھوں کو توڑ دوں گی ۔جو سفلی خواہش کی تسکین کے لئے میری طرف بڑھیں گے ۔ان قدموں کو کاٹ دوں گی جو کسی ناجائز خواہش کی تکمیل کے لئے اس طرف

اٹھیں گے۔میں اپنے بیٹے کے لئے قابل فخر ماں بنوں گی۔میرے کردار کی جگمگاتی روشنی میں میرا بیٹا اپنے لئے راستہ پہچانے گا۔"

اس نے نماز پڑھی اور خاصی مطمئن ہو کر شام کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔

اور پھر تپتی ہوئی اس دوپہر کی شدید گرمی میں جس کی گھٹن سے اس کا دم کبھی کبھی رکنے لگتا۔خوشگوار ہوا کا ایک ایسا جھونکا آیا جو اس لو کی تمازت کو کم کر گیا۔

شیخ صاحب کے دو چھوٹے بھائی کویت میں مقیم تھے۔انہوں نے وہاں چند ٹھیکے لئے اور شیخ صاحب کو آنے کیلئے لکھا۔۔۔۔دولت سمیٹنے والی بات تھی۔۔۔جانے کے لئے فوراً رضامند ہو گئے۔لیکن اب ان کے سامنے سکول کا مسئلہ تھا۔۔۔بیگم تعلیم یافتہ نہ تھیں جنہیں سکول کی ذمہ داریاں سونپی جا سکتیں۔ہیڈ مسٹرس کی شادی ہونے والی تھی۔ایسے وقت میں انہیں رفعت سے زیادہ قابل اعتماد کوئی فرد نظر نہ آیا۔چنانچہ سکول کی تمام ذمہ داری اسے سونپ کر وہ کویت روانہ ہو گئے۔۔۔

وقت کسی لاابالی حسینہ کی طرح بڑھ رہا تھا۔رفعت کے معصوم چہرے پر اب وقار کی تہیں اپنے لئے جگہ بنا رہی تھیں۔ثاقب جوان ہو رہا تھا۔بیٹے کو دیکھتے ہی ان کے جامد ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ بکھر جاتی۔۔۔۔آنکھوں میں محبت کے کنول جگمگا اٹھتے۔

تفکرات و آلام کو مسکراہٹوں کے پھریروں میں اڑانے والا شوخ و شنگ بیٹا ایک پل کے لئے ماں کو اداس نہ رہنے دیتا۔ہر سال فسٹ آتا۔کھیلوں میں تقریری مقابلوں اور دوسری غیر نصابی سرگرمیوں میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا۔اساتذہ کو اس پر فخر تھا۔سکول کو اس پر ناز تھا۔کبھی کبھی شیخ صاحب کا اسکول سے متعلق مختصر سا خط آتا۔اور وہ انہیں حالات سے مطلع کر دیتیں۔۔۔۔سکول خاصی ترقی کر رہا تھا۔

یونہی پانچ سال بیت گئے۔

اور پھر وہ درخشاں صبح طلوع ہوئی۔جس نے ان کے مصائب پر سکون و شانتی کے پھائے رکھ دیئے۔وہ اپنے غموں کو بھول گئیں۔کلفتوں کو فراموش کر گئیں۔

ثاقب نے میٹرک میں ٹاپ کیا تھا۔اخباری نمائندے اس سے ملنے کے لئے آئے۔اس سوال کے جواب میں کہ وہ مستقبل میں کیا بننا چاہتا ہے۔۔۔کس فخر سے اس نے ماں طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔

"پاکستان ایئر فورس کا ایک جانباز ہواباز۔"

وہ خود بھی مسکرا دی تھیں۔

اب وہ کالج میں ایف،ایس،سی میں داخلہ لے چکا تھا۔

انہی دنوں شیخ صاحب واپس پاکستان آگئے۔چند دن ان کی آمد کے ہنگامے میں گزر گئے۔فرصت ملی تو انہوں نے رفعت سے سکول کی کارکردگی اور مالی امور کی تفصیل جاننا چاہی۔

سکول سے متعلق امور کے ایک ایک پہلو پر رفعت نے تفصیلی روشنی ڈالی۔شیخ صاحب فی الواقع ان کی انتظامی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔سکول کی آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔

جذباتی اور بوجھل آواز میں بولے۔

"رفعت! آپ کے یہ چار پانچ سال کیسے گزرے؟"

"شیخ صاحب!یہ سال تو میرے لئے بہت بابرکت ثابت ہوئے۔ان سالوں میں مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر ملی۔آگ کی وہ تپش جو مجھے جلائے جا رہی تھی۔۔۔اس کی حدت میں کمی ہوگئی۔میرا کمرہ میرے بیٹے کے حاصل کردہ انعامات اور کپوں سے بھر گیا اس

کی ذہانت منٹگمری سے نکل کر پورے پنجاب میں پھیل گئی۔۔۔شیخ صاحب! بیٹے جوان ہو جاتے ہیں تو مصائب کے بار بانٹ لیتے ہیں۔

شیخ صاحب تو رفعت کو اپنا دردِدل سنانا چاہتے تھے۔پانچ سال پر پھیلی ہجر وفراق کی داستان اس کے گوش گزار کرنا چاہتے تھے۔لیکن۔گفتگو حد درجہ جذباتی موڑ اختیار کر چکی تھی۔ان کے ضمیر نے انہیں ملامت کی اور ابھرتے ہوئے شیطان کو دبا دیا۔وہ خاموش رہے۔

مگر انسان ازلی خودغرض ہے۔وہ دوسروں کی مجبوریوں سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتا ہے۔شیخ صاحب کا اندر کا شیطان بھی انہیں ابھارتا رہا۔ترغیب دیتا رہا۔اور پھر ایک دن انہوں نے ایک طویل خط میں اپنے سارے جذبات سمودیئے اور انہوں نے رفعت کو شادی کی پیش کش کر دی۔

جب یہ خط رفعت کو ملا۔۔۔تو ان کے چہرے پر گہرا کرب پھیل گیا ذہن میں طوفانی لہریں اٹھیں اور دماغ ان طوفانی لہروں میں ہچکولے کھانے لگا۔

خاصی دیر بعد اس نے خود پر قابو پایا۔۔۔یہ کوئی نئی اور انوکھی بات تو نہ تھی۔۔۔کاغذ قلم پکڑا۔۔۔اور دل کا خون کاغذ پر بکھرنے لگا۔

شیخ صاحب! آپ کی پیش کش کا شکریہ۔۔۔نظر کرم کی ممنون ہوں جس نے عزت کا یہ تاج پہنانے کے لئے مجھے منتخب کیا۔۔۔آپ کو میری سلگتی تنہائیوں کا احساس ہے۔آپ کو میرے غموں میں جلنے کی تکلیف ہے۔آپ میرے غم بانٹنا چاہتے ہیں۔۔۔شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔اگر ان تنہائیوں کو کسی کے وجود سے مہکانا ہی مقصود ہوتا تو میں اب تک کسی جواں سال انسان کا ہاتھ تھام چکی ہوتی،خود سوچئے میں آپ کی شریک حیات کیسے بن سکتی ہوں۔۔۔میں نے آپ کو بتایا بھی تھا کہ میں

کس گھرانے کی بہو بیٹی ہوں، کس شوہر کی محبوب بیوی تھی۔

شیخ صاحب! مجھے اپنے شوہر سے پیار ہی نہیں جنون کی حد تک عشق ہے۔اور یہ عشق اس وقت تک رہے گا جب تک سانس کی آمدورفت جاری ہے۔۔۔آپ نے لکھا ہے کہ اس لگاؤ کے پیش نظر جو مجھے آپ سے ہے، میں ایک ایسا مضبوط رشتہ استوار کرنا چاہتا ہوں جو ہماری دائمی رفاقت کا ضامن ہو"۔۔۔۔میں پوچھتی ہوں شیخ صاحب! آخر آپ کو یہی رشتہ کیوں پسند ہے، مقدس ترین رشتے آپ کی نگاہ سے کیوں اوجھل ہیں؟ مجھے اپنی بہن بنا کر بھی تو آپ کے ان جذبات کی تسکین ہو سکتی ہے۔۔۔لیکن میں جانتی ہوں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔اے کاش آپ نے میرے مجبوریوں کو کبھی سمجھا ہوتا۔۔۔۔"

خط لکھ کر اس نے رکھ دیا۔۔۔ثاقب کالج سے آیا۔مسکراتا، ہنستا، شگفتہ چہرہ۔ماں کے چہرے پر چھائی غم کی گھٹائیں اسے پھر نظر آ رہی تھیں۔بازوؤں میں پکڑ کر زور سے گھمایا۔لیکن آج رفعت کو ہنسی نہ آئی۔

" کیا بات ہے امی؟"اس نے ماں کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

" کل تم اپنے کالج سے سرٹیفکیٹ لے آؤ۔ہم کل شام تک اس شہر کو چھوڑ دیں گے۔"

" کیوں؟"اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

انہوں نے اپنا اور شیخ صاحب کا خط بیٹے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ثاقب کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔مٹھیاں غصے سے بھنچ گئیں۔چہرے سے وحشت برسنے لگی۔

"میں اس حرام زادے کا ابھی قیمہ کرتا ہوں۔۔۔"وہ مشتعل ہوا تھا۔

"نہیں ثاقب! ضبط کرنا سیکھو بیٹے! زندگی ہم جیسے لوگوں کے لئے ناسور سے کم

نہیں ۔ابھی ایک زخم کا رستا بند نہیں ہوتا کہ اس پر ایک اور زخم کا اضافہ ہو جاتا ہے۔اپنے دامن سے کپڑا اٹھاؤ گے تو خود ننگے ہو جاؤ گے۔"

اگلی شام ماں بیٹا ملتان جا رہے تھے۔

باب نمبر:۱۸

ان کی نئی منزل ملتان تھی ۔شہر کے گلی کوچوں میں دو دن کی تگ و دو کے بعد وہ ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔سر چھپانے کو ٹھکانہ ملا تو ثاقب کو کالج میں داخل کروایا گیا ۔اشیائے خوردنی کی خریداری کے بعد رفعت نے حساب لگایا تو ان کے پاس کل تین سو روپے تھے ۔یہ رقم چند ماہ کی گزر اوقات کے لئے تو کافی ہو سکتی تھی ۔مگر اس کے ختم ہونے کے بعد کیا ہوگا؟ بے اختیار انہوں نے سوچا۔۔۔۔

سروس کئے بغیر زندگی کی یہ گاڑی کھینچنی انتہائی مشکل ہو جائے گی ۔

"سروس ۔"

انہوں نے گھٹی گھٹی سوچوں کے درمیان الجھتے ہوئے بے اختیار خود سے کہا۔

سابقہ تلخ تجربات ان کے سامنے آئینے کی طرح تھے ۔خودغرض اور مفاد پرست لوگوں کی مثالیں ان کے سامنے تھیں ۔کون کس کا سہارا بنتا ہے؟

ڈگمگاتی کشتی کبھی کبھی سہارے تلاش کرتے کرتے ڈوب جاتی ہے ۔سطح سمندر پر

ایک لمحے کیلئے بھنور پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے لمحے سطح ساکن ہو جاتی ہے۔کوئی نہیں جانتا اور نہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ ایک مجبور اور بے بس انسان کن دکھوں میں گھرا اور ختم ہو گیا۔اس رات انہوں نے ثاقب سے سروس کے متعلق بات شروع کی ہی تھی کہ اس نے ماں کی بات کو سختی سے کاٹ دیا۔

"نہیں امی!۔۔۔آپ مصائب کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گئی ہیں۔دنیا بہت کم ظرف ہے وہ آپ کی عظمت کو نہیں پہچان سکتی۔میں اب جوان ہوں، جوان اور باعزم بیٹے کی ماں اب مزید تکالیف برداشت نہیں کرے گی۔

بیٹے کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کب تھے؟یہ تو شبنم کے قطرے تھے۔جنہوں نے ان کی جلتی روح کو لطیف ٹھنڈک کا احساس دیا۔یوں لگا جیسے تاریک تاریک راہوں پر روشن دیئے جگمگا گئے ہوں۔

چند دن اور بیت گئے وہ پریشان تھیں ان کی پریشانی کو ثاقب خوب جانتا تھا۔وہ ہر وقت انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔۔۔کتنے دنوں سے وہ اخبار دیکھ رہی تھیں۔ایک دو نزدیکی سکولوں کا چکر بھی لگا آئی تھیں۔لیکن کہیں بھی کامیابی نہ ہوئی۔اس دن ثاقب ماں کی پریشانی دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

"امی میں نے کتنی بار کہا ہے،آپ تفکرات کا بوجھ اپنے کندھوں سے اتار پھینکئے اب انہیں اٹھانے کی میری باری آگئی ہے میں نے چند لوگوں سے ٹیوشنز کے بارے میں کہا ہے مجھے امید ہے خدا جلد کوئی بندوبست کر دے گا۔"

"تم ٹیوشن کرو گے؟"

رفعت چیخ اٹھیں۔ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔چودہ سالہ بیٹا،جس کے ابھی کھیلنے،کھانے کے دن تھے۔کن سوچوں میں گھر گیا ہے۔

"نہیں ثاقب میری زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔تو نے جس دن یہ کام کیا رفعت مرجائے گی۔"

"امی! یوں جذباتی نہ بنیئے!"

"کچھ بھی ہو ثاقب۔۔۔تمہارے لئے تو مجھے اگر بھیک بھی مانگنی پڑی تو میں اس سے گریز نہیں کروں گی۔"

اس بات کے دو تین دن بعد رفعت نے اخبار میں ملتان کے کسی لینڈ لارڈ کا دیا ہوا اشتہار پڑھا جس نے اپنی پندرہ سالہ بیٹی کے میٹرک کے امتحان کی پرائیویٹ طور پر تیاری کیلئے لئے کسی خاتون کی خدمات معقول معاوضہ کے عوض مانگی تھیں۔ثاقب کالج چلا گیا تو وہ اخبار کا ٹکڑا لئے مطلوبہ جگہ کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔

ایک گھنٹے بعد وہ قدیم طرز کے ایک عالیشان مکان کے سامنے کھڑی تھی۔لمبی لمبی گھنی مونچھوں اور سرخ و سپید رنگت والا نوکر بندوق پکڑے ڈیوڑھی میں بیٹھا تھا۔ان کے داخل ہونے پر اس نے کڑی نظروں سے رفعت کو گھورا۔اوران کے بتانے پر وہ انہیں ساتھ لے کر وسیع و عریض ڈرائینگ رام کی طرف بڑھا۔انہیں وہاں بٹھا کر وہ گھر کے مالک کو اطلاع دینے کے لئے چلا گیا۔

فون کی گھنٹی ٹنٹنائی اور تبھی ایک معمر اور باوقار سا مرد کمرے میں داخل ہوا۔بغیر کسی طرف دیکھے وہ فون کی طرف لپکا۔کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے ریسیور کریڈل میں رکھ دیا اور عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بی بی! آپ کیسے تشریف لائی ہیں۔۔۔۔؟"

رفعت نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا۔

"لیکن ہمیں تو کوئی پردہ نشین عورت چاہیے۔"

وہ تڑپ اٹھیں "پردہ نشین خاتون!"

لہجے میں زہر کی سی تلخی گھولتے ہوئے بولیں ۔۔۔۔" کردار کی عظمت اور پاکیزگی پردے کی ہرگز محتاج نہیں ۔ برائیاں بسا اوقات پردے کی اوٹ میں جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہیں ۔۔۔محترم! پردہ پارسائی کی ضمانت تو نہیں ۔۔۔۔"اس کے لہجے میں تلخ حقائق کی گونج تھی ۔دل کو تڑپا دینے والا سوز تھا۔

"ستم رسیدہ معلوم ہوتی ہو۔" معمر مرد نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

دل کے زخموں کو کسی نے کرید دیا تھا۔

المناک ساز کو چھیڑ دیا تھا۔

ذرا سی محبت وشفقت نے ضبط کا بند توڑ دیا۔

آنکھوں میں لہراتے آنسوؤں کے درمیان انہوں نے مختصر سی داستان انہیں سنا ڈالی ۔اور جب وہ خاموش ہوئیں تو معمر مرد کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھے،اور پیار سے ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"بیٹی تمہیں گلہ ہے۔ تمہیں انسانوں سے شکوہ ہے فی الواقع اس پرفریب دنیا سے خلوص کی توقع بے کار ہے ۔لیکن یاد رکھو انسانیت ابھی زندہ ہے اور انسان بُرائی کے راستے پر تیزی سے گامزن ہوتے ہوئے بھی نیکی کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔انسانی غیرت و حمیت کو جب بھی للکارا جائے تو وہ پورے جوش سے میدان عمل میں نکل آتی ہے ۔میری بیٹی ابھی انسانی ضمیروں میں اچھائی کی رمق باقی ہے تم آج سے میری بیٹی ہو ۔بھول جاؤ کہ دنیا میں تمہارا کوئی نہیں ۔۔۔۔"

پھر انہوں نے رفعت کا اپنی بیٹیوں سے تعارف کروایا۔ پندرہ،سترہ سال کی بھولی بھالی معصوم لڑکیاں بہت جلد ان سے مانوس ہوگئیں ۔

جس سکون کی انہیں تلاش تھی وہ سکون انہیں مل گیا،وہ خوش تھیں۔بہت خوش!۔۔۔۔

لیکن چند روز کے تجربے ہی نے انہیں یہ اچھی طرح سمجھا دیا کہ سکون ان کے مقدر سے حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے۔۔۔۔جو خوشی انہیں ملی تھی اس خوشی کے دامن میں بھی کانٹے پنہاں ہیں۔

جن دنوں وہ یہاں آئی تھیں گھر کی مالکن مسز خان شوہر سے لڑ کر میکے گئی ہوئی تھیں۔سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اتنی پرخلوص شخصیت سے بھی کوئی بیوی لڑسکتی ہے۔بچیوں کو ذرا سا کریدنے سے ہی پتہ چل گیا کہ وہ کس طبیعت کی مالک ہیں۔۔۔انہوں نے بچیوں کی مدد سے خاں صاحب کو مجبور کیا کہ وہ انہیں گھر لے آئیں۔

اور جب وہ آئیں تو رفعت کو اس تنقیدی انداز میں انہوں نے دیکھا کہ رفعت کا ماتھا ٹھنکا۔شوہر کے سامنے تو کچھ نہ بولیں لیکن وہ اٹھ کر باہر گئے تو بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"یہ گھر تو اب مجھے لنگر خانہ معلوم ہوتا ہے۔"

رفعت کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کانوں میں سیسہ پگھا کر ڈال دیا ہو۔زخمی نگاہوں سے ایک ثانیہ کے لئے دیکھا۔اسی لمحہ ان کے کانوں میں سمیعہ (خان صاحب کی بڑی بیٹی) کی آواز گونجی۔

"امی ہم بتا نہیں سکتے کہ رفعت باجی کتنی اچھی ہیں،اتنی پیاری اور عظیم۔"

"ہوں!"

اس "ہوں" میں کتنا طنز تھا، کتنا زہر تھا اور نگاہوں کا وہ انداز۔۔۔!

وہ ان نگاہوں کی زبان کو خوب سمجھتی تھیں۔۔۔۔یہ نگاہیں ان کی غیور فطرت کے

لئے کھلا چیلنج تھیں۔

وہ ان نگاہوں کو جوان کی پاکیزگی اور عظمت کے لیئے شبہ لیئے اٹھتیں واپس لوٹانا اچھی طرح جانتی تھیں۔ ہر چیز کھو کر انہوں نے یہی تو حاصل کیا تھا۔۔۔وہ مر جانا پسند کرتی تھیں۔۔۔لیکن اپنی آن اور خودداری کو مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

سلگتی آنکھوں اور دکھے دل سے اٹھیں۔۔۔تبھی کمرے میں خان صاحب آ گئے۔

"بیٹھو رفعت بیٹی کہاں چلیں؟"

"بیگم! دیکھو خدا نے ہمیں ایک اور بیٹی دے دی۔"

"پہلے دو کیا کم تھیں جو ابھی تیسری کی آرزو باقی تھی۔"

آنکھوں میں گہرا کرب پیدا ہوا۔ چہرے پر کتنے رنگ آئے اور گزر گئے۔ وہ خاموش رہیں۔

رفعت جانے لگیں۔ سمیعہ، ربیعہ اور خان صاحب باہر نکل آئے۔

"بیٹی تمہیں اس کی باتوں سے یقیناً تکلیف ہوئی ہوگی۔۔۔لیکن وہ جاہل عورت قابل معافی ہے۔ اسے انسانیت کی عظمت کا احساس نہیں۔"

لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ ایک اور کاری ضرب تھی جس نے ان کے زخموں کو چھیل کر رکھ دیا۔ زخموں سے درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔۔۔اتفاق ایسا ہوا کہ اسی دن شام کو خان صاحب کو اپنے ایجنٹ کے بلاوے پر فوری طور پر قاہرہ جانا پڑا۔ وقت اتنا کم تھا کہ وہ رفعت سے نہ مل سکے، سمیعہ کو خاصی معقول رقم رفعت کے لئے دے گئے۔ اگلے دن دونوں لڑکیاں ان کا انتظار بے چینی سے کرتی رہیں۔۔۔رات ڈھلتی دیکھ کر ربیعہ نے ماں سے رفعت

کے ہاں جانے کی اجازت چاہی۔لیکن ماں تو بپھر اٹھی وہ بے نقط سنائیں کہ اسے کانوں پر ہاتھ رکھتے بن پڑی۔

اگلے دن بیگم خان کہیں گئیں۔موقعہ غنیمت تھا۔ربیعہ پیسے لے کر چل کھڑی ہوئی۔رفعت سے نہ آنے کی شکایت کی تو انہوں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا۔لیکن جب ربیعہ نے ماں کے رویہ کی ان سے معذرت چاہی تو رفعت بڑے اندوہ گیں لہجے میں بولیں۔

"ربیعہ تمہاری محبت سے محرومی کا مجھے خود بہت صدمہ ہے۔لیکن حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ صدمہ بھی سہنا ہوگا۔تمہیں پڑھانے اور تمہارے گھر آنے کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"باجی!۔۔۔آپ کو آغا جی،امی کے متعلق تفصیلاً بتا بھی چکے ہیں۔ان کی فطرت ہی ایسی ہے۔"

انہوں نے ایک لمحے کے لئے نگاہیں اٹھا کر ربیعہ کو دیکھا۔اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔"ربیعہ ہم نے غربت میں کبھی اپنی خودی بیچی نہیں۔"مزید اصرار کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ربیعہ نے پیسے انہیں دینے چاہے۔لیکن انہوں نے سختی سے انکار کر دیا۔

دن تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔مستقبل کسی خوف ناک اندھیرے غار کی طرح ان کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔گھر کی کئی چیزیں وہ اونے پونے فروخت کر چکی تھی اور اب پھر پیسے ختم ہو رہے تھے۔وہ بے بسی سے دن گزارے جا رہی تھیں۔ثاقب کے سامنے حتی الامکان خوش رہنے کی کوشش کرتیں۔لیکن جب وہ چلا جاتا تو سوچتے سوچتے بسا اوقات ان کا دماغ پھٹنے لگتا۔پھٹ کر ہی انہیں اگر سکون مل جاتا تو بھی غنیمت تھا۔لیکن اسے تو جانے ابھی کیا کچھ اور سہنا تھا۔اور اس دن گھر میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔

پاگلوں کی طرح انہوں نے ایک ایک چیز کوٹٹولا۔لیکن اس گھر میں تھیں ہی کتنی اشیاء چند ایک اوران میں سے ہر ایک کی ضرورت ناگریز، کسے فروخت کریں اور کسے رکھیں۔کتنی بے بسی تھی، کتنی مجبوری تھی، کتنا یاس تھا؟

وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔وہ وقت سے خائف تھیں وہ سوچ رہی تھیں کہ ثاقب کالج سے آکر تو کیا کھائے گا؟یہی سوچ انہیں پاگل کئے دے رہی تھی۔

دیوار سے سر ٹکائے وہ لامحدود سوچوں میں گم تھیں ان سوچوں میں جو ان کے زخمی دماغ کو اور بھی زخمی بنا رہی تھیں۔ویران ویران آنکھوں سے انہوں نے صحن میں دیکھا جہاں دوپہر کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔

"خدایا!۔۔۔۔وقت رک جائے۔۔۔۔کائنات کی گردش تھم جائے کوئی ان بھاگتی دوڑتی ساعتوں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دے۔"

ناگاہ ان کی نظر اپنی انگلی پر پڑی جس میں ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

''میں کہاں بھٹک رہی تھی؟۔۔۔۔۔مجھے اس انگوٹھی کا خیال کیوں نہیں آیا؟۔۔۔۔"

تیزی سے ہاتھ بڑھا کر انگوٹھی کو اتارنا چاہا مگر دل میں ایک درد سا اٹھا اور دایاں ہاتھ جو انگوٹھی اتارنے میں مصروف تھا وہی جامد ہو کر رہ گیا۔کہیں قریب ہی سے پیار میں ڈوبی ہوئی ایک بوجھل آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔"رفی!۔۔۔۔یہ اس پیار کی اولین نشانی ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے ہے اسے کبھی خود سے جدا نہ کرنا۔"

یہ محبوب آواز ان کے بچے کھچے ضبط وقرار کو لوٹ کر لے گئی۔وہ خوش گوار اور حسین دن جو ایک جھونکے کی طرح آئے اور ان کی روح کو وقتی طور پر معطر کرنے کے بعد اس میں خزاں کے زرد زرد پتے ڈال کر چلے گئے۔

فرش پر دیوار کے سہارے ٹیک لگائے آنکھوں میں حسرت و نامرادیوں کے سائے لئے وہ ان دنوں کے تصور میں گم تھیں ۔۔۔سر کو دیوار سے ٹکراتے ہوئے وہ دردناک آواز مین گنگنائیں

کوئی کچھ پتہ بتا دے تو نکل کے آشیاں سے

وہ بہار ڈھونڈ لاؤں جو بدل گئی خزاں سے

ہمسائے کا بچہ سکول سے آیا وہ چونک پڑیں ۔ثاقب کالج سے آنے والا تھا۔ایک بار انہوں نے پھر دیکھا۔کشمکش کی کیفیت ذہن میں پیدا ہوگئی ۔

"یہ انگوٹھی تمہاری نشانی ہے ہمایوں!۔۔۔تم نے مجھے اسے خود سے کبھی دور نہ کرنے کیلئے کہا تھا۔لیکن تمہاری زندہ نشانی ثاقب کو اس کی ضرورت ہے۔میں اسے بیچ ڈالوں گی، بیچ ڈالوں گی، بیچ ڈالوں گی۔

وہ پاگلوں کی طرح انگوٹھی کو ہاتھ میں پکڑ کر خود سے باتیں کر رہی تھیں جب ثاقب کمرے میں داخل ہوا۔

"امی!۔۔۔۔کسے بیچ ڈالیں گی آپ؟"

چونک کر نگاہیں اٹھائیں۔

"آپ کو کیا ہو گیا امی؟"اس نے فرش پر بیٹھتے ہوئے ماں کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔شگفتہ چہرہ ماں کی یہ حالت دیکھ کر افسردہ وملول سا ہو گیا۔

وہ خاموشی سے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

"امی!"وہ دلگیر سے لہجے میں بولا۔

"ماضی کو بھلا دیجئے امی!۔۔۔۔ماضی ہمیں تلخ یادوں، آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔آپ بھول جایئے۔سب کچھ بھول جایئے۔امی!۔۔۔ہر شب کی سحر

ہے۔اسی طرح ہماری سحر بھی تو کبھی نہ کبھی طلوع ہوگی۔"

"کب؟جب ہم ختم ہو جائیں گے۔۔۔"۔انہوں نے تڑپ کر کہا۔

"نہیں امی!گھٹا ٹوپ اندھیرے چھٹنے ہی والے ہیں۔۔۔"

"آج تمہارے لئے کھانے کو کچھ نہیں ہے۔انہوں نے بیٹے کو گلے سے لگالیا۔

"گھبراتی کیوں ہیں امی!جس عالی حوصلگی کا مظاہرہ آپ سدا سے کرتی آرہی ہیں اس کا دامن کیوں چھوڑ رہی ہیں۔عزم کو جوان رکھئے۔۔۔ہم مصائب کے پہاڑوں سے ٹکرا کر اپنے لئے راستے تلاش کریں گے۔۔۔"اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے زندہ اور باعزم آواز میں کہا۔

''اٹھیئے امی!۔۔۔منہ ہاتھ دھوئیے۔میں کھانے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔۔۔"اس نے ماں کا ہاتھ منہ دھلوایا۔۔۔بالوں میں کنگھی کی اور سہولت سے بستر پر لٹا دیا۔

تھکی تھکی آنکھیں۔۔۔تھکا تھکا بوجھل دماغ۔۔۔زخمی دل بیٹے کے اتنے بے پناہ التفات سے قدرے تسکین پا گیا تھا۔

کوئی غم بانٹنے والا ہو۔۔۔تو غم کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔

انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

ثاقب نے الماری سے انعامی کپ نکالے اور بازار کی طرف چل دیا۔کپوں کو اونے پونے فروخت کر کے اس نے خاکی کاغذ اور خوردنی اشیاء خریدلیں۔

واپس آیا تو رفعت کو بدستور آنکھیں بند کئے پایا،وہ سوگئی تھیں۔

چولہا جلایا کھانا تیار کیا۔لئی پکائی اور پھر ماں کو آہستگی سے اٹھایا۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر اس نے لئی کا پیالہ اور کاغذ اپنے سامنے رکھتے

ہوئے ماں سے کہا۔

ا"می! آیئے میں آپ کولفافے بنانے سکھاؤں۔ان لفافوں کی بازار میں بہت مانگ ہے۔"

رفعت حیرت سے بھونچکی سی رہ گئیں۔

"لفافے ۔۔۔۔"ان کی آنکھوں میں درد سا ابھرا۔

"تم لفافے بناؤ گے؟۔۔۔۔"دکھ بھرے لہجے میں انہوں نے کہا۔

" کیاحرج ہے؟"وہ شگفتگی سے ہنس دیا۔

اور دوسرے ہی لمحے وہ جھک کر کاغذ کاٹنے لگا۔

" آہ!۔۔۔۔گردش زمانہ تجھے کیا کہوں؟یہ ڈاکٹر اکرم کا پوتا، یہ کیپٹن ہمایوں کا بیٹا ثاقب۔آج پیٹ پالنے کے لئے لفافے بنا رہا ہے۔

آنکھوں میں دکھ کا جال سا تن گیا۔

" آپ پھر مجھے اداس نظر آرہی ہیں امی!"

ماں نے ایک پَل کے لئے بیٹے کی نگاہوں میں جھانکا اور پھر سر جھکا کر وہ اس کے ساتھ کام میں لگ گئیں۔۔۔۔

ثاقب کام کے ساتھ ساتھ انہیں کالج کی پُر لطف باتیں سناتا رہا، ہنستا رہا، ہنساتا رہا اور دو تین گھنٹوں میں وہ دونوں دو تین سو لفافے بنا چکے تھے۔

کھانے کا گزارہ ہو رہا تھا۔لیکن ثاقب کے کالج کی فیس اور مکان کا کرایہ۔۔۔۔ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

خان صاحب واپس آئے، ربیعہ سے انہیں تمام حالات کا علم ہوا۔۔۔۔اسی شام وہ رفعت کے گھر آئے۔۔۔۔انہیں سمجھایا،۔۔۔۔باپ کی سی شفقت برتتے ہوئے

انہیں ڈانٹا۔اور اخراجات کے لئے پیسے دینے چاہے۔۔۔لیکن وہاں ایک ہی انکار تھا۔۔۔

"نہیں خان صاحب !جب آپ کی بیگم کو پتہ چلے گا تو جانے کیا کیا الزام تراشیں۔۔۔"

وہ پیار سے بولے۔۔۔"رفعت !۔۔۔میں نے بیٹی بنایا ہے۔۔۔بیٹی یوں کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارے۔یہ مجھ جیسے غیور انسان کی برداشت سے باہر ہے۔منہ بولے رشتے کبھی کبھی خون کے رشتوں کو بھی مات دے دیتے ہیں۔۔۔تمہیں یہ پیسے لینے ہی ہوں گے۔"

اتنے میں ثاقب کالج سے آگیا۔مسکراتے ہوئے خان صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "امی!ضد چھوڑیئے۔۔۔لایئے آغا جی ہم آپ کی اس بروقت امداد کے شکرگزار ہیں۔۔۔"

"ثاقب !۔۔۔تمہیں یہ پیسے نہیں لینے چاہیئے تھے۔"

ان کے جانے کے بعد رفعت نے بیٹے سے کہا۔

"ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے۔امی حالات بدل جائیں گے تو ہم ان کے احسان کا بدلہ بہتر طریقے سے چکادیں گے۔"

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

باب نمبر:۱۹

نیلگوں مدہم روشنی میں ڈوبی خواب گاہ کا ماحول بہت سحر انگیز تھا۔جدید طرز کے سپرنگ دار پلنگوں پر چونتیس پنتس سالہ ایک شکیل مرد اور ستائیس اٹھائیس سالہ ایک خاتون محو خواب تھی ۔وجیہہ مرد کی نیند میں ڈوبی مخمور آنکھیں آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئیں ۔یوں جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔فراخ پیشانی پر اندرونی کشمکش سے شکنیں پڑ گئی تھیں ۔آنکھیں بے چین کیفیت کی غماز تھیں ۔

اضطراب سے وہ اٹھ بیٹھے ۔چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر گہرے کرب سے سر پلنگ کی پٹی سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں ۔

دل کا درد بڑھتا جا رہا تھا ۔ضبط کا یارا نہ تھا ۔نائٹ گون پہنے وہ باہر آ گئے ۔فلک پر صبح کا روشن ستارہ ۔۔۔۔اپنی پوری آب و تاب سے نمودار ہو کر طلوع سحر کی نوید دے رہا تھا۔

اداس نگاہوں سے وہ ستارے کو دیکھ رہے تھے ۔تصور کی آنکھ ستارے پر لہراتے ،بل کھاتے ایک ننھے منے چار سالہ پیکر کو تھرکتے دیکھ رہی تھی ۔

ان کے قلب کی گہرائیوں سے درد میں لپٹی ہوئی آہ نکلی۔آج انہوں نے ثاقب اور رفعت کو پھر خواب میں دیکھا تھا۔۔۔۔جب بھی وہ ان کے متعلق خواب دیکھتے ان پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو جاتی۔آنکھوں سے نیند کافور ہو جاتی۔اور وہ ساری رات لان میں ٹہلتے ہوئے گزار دیتے۔

انہیں ڈھونڈنے کے لئے انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔۔۔کہاں کہاں نہیں گھومے۔۔۔۔کس کس سے نہیں ملے۔۔۔۔ریڈیو، اخبارات، انہوں نے مقدور بھر کوشش کی لیکن وہ انہیں نہ پا سکے۔۔۔۔

وہ جو ان کی بہن تھی۔۔۔۔۔ان کی دوست تھی۔۔۔۔ان کی غم زدہ بھابھی تھی۔۔۔۔وہ جس سے انہیں بے تحاشا پیار تھا۔۔۔۔

وہ بچہ ان کے پیارے بھائی کی نشانی۔۔۔۔ثاقب، جس کے لئے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ کبھی اس کو یہ محسوس نہ ہونے دیں گے کہ اس کا باپ نہیں ہے۔۔۔۔آہ!۔۔۔۔جانے وہ کہاں ہیں؟۔۔۔۔زندہ بھی ہیں یا ختم ہو گئے ہیں۔۔۔۔یہ آزادی انہیں کتنی مہنگی پڑی تھی۔وہ عزیز ترین ہستیوں سے بچھڑ گئے تھے۔ان کے والد اور والدہ کو یہی غم لے ڈوبا اور اب انہیں بھی گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

آرام دہ بستر پر لیٹے ہوئے۔۔۔۔کھانا کھاتے ہوئے۔۔۔۔میڈیکل کالج میں طلباء کو لکچر دیتے ہوئے جب ان کا خیال آجاتا تو اس سے آرام دہ بستر پر کانٹے بچھ جاتے۔کھانا ان کے لئے زہر بن جاتا اور کالج میں لکچر دیتے ہوئے وہ کھو سے جاتے۔

یہ پریشانیوں مبتلا، یہ تفکرات میں گھری وجیہہ شخصیت اورنگ زیب کی ہے۔جو میڈیکل کالج میں ایک قابل پروفیسر اور بہترین ڈاکٹر مانے جاتے تھے۔

اس اندھیری شب میں جب وہ خواتین کو لئے بے سدھ ایک دوسرے کے پیچھے

بھاگتے بھاگتے۔۔۔۔نسبتاً ایک محفوظ مقام پر پہنچے۔تو انہوں نے رک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنے درمیان رفعت اور ثاقب کو نہ پا کر ان کے دل بیٹھ گئے۔اسی لمحے عورتوں کو کھیتوں میں چھپا کر اسد اور راو رنگ زیب دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگے۔۔۔۔ساری رات وہ پاگلوں کی طرح انہیں تلاش کرتے پھرے۔لیکن انہیں نہ ملنا تھا، نہ ملے۔

ان کے دل غم سے بیٹھ گئے۔یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ پاکستان آرمی کے دستوں نے انہیں سنبھال لیا تھا۔انہوں نے ہر ممکن کوشش انہیں ڈھونڈنے کی کی مگر بے سود۔زخمی دلوں کے ساتھ وہ پاکستان آ گئے۔زندگی کی ہر آسائش انہیں میسر آ گئی تھی۔لیکن ان کے دلوں میں جو ناسور پڑ گئے تھے ان کا کوئی علاج نہ تھا۔۔۔۔ابھی ہمایوں زخم تازہ تھا اور اس پر یہ نیا چرکہ۔۔۔۔

باب نمبر:۲۰

میڈیکل کالج میں آل پاکستان انٹر کالجیٹ مباحثہ تھا موضوع تھا

"Is man selfish by nature"

(کیا آدمی فطرتاً خودغرض ہے)

کرسی صدارت کو جب صاحب صدر نے رونق بخشی۔۔۔۔اور جج صاحبان نے بھی اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں تو کارروائی کا آغاز ہوا۔

کتنے ہی لڑکے اور لڑکیاں سٹیج پر آئے۔اور موضوع کی حمایت ومخالفت میں اپنے اپنے دلائل دے کر چلے گئے۔تبھی سکریٹری کی آواز گونجی۔

"ثاقب ہمایوں۔گورنمنٹ کالج ملتان۔موضوع کی حمایت میں۔"

ڈاکٹر اورنگ زیب جو جج کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔اُس وقت کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔اس آواز پر بری طرح چونک گئے۔دیوانہ وار ان کی نگاہیں اٹھیں اور اس نوجوان پر جم گئیں جو پُر وقار قدموں سے سٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔اور جب وہ ڈائس کے

سامنے آکر کھڑا ہوا تو انہوں نے اپنی ذہنی دنیا میں شدید جھٹکے محسوس کئے۔پہچاننے میں ذرا بھی تو دقت نہ ہوئی۔۔۔۔دقت ہوتی بھی تو کیسے۔۔۔۔وہ ثاقب کب تھا؟وہ تو ہمایوں تھا۔۔۔۔ان کی آنکھیں کیسے دھوکا کھا سکتی تھیں؟اسے تو ان کی روح بھی پہچانتی تھی۔

وہ دریایاب،ان کے خاندان کا چراغ،ہمایوں کی نشانی کبھی انہیں مل بھی سکے گی۔۔۔۔وہ قطعی مایوس ہو چکے تھے۔۔۔۔جدائی کا جان لیوا احساس،انتہا درجے کی مایوسی،اور اب یہ جاں فزا احساس شریانوں میں دوڑتے لہو کی گردش تیز کر رہا تھا۔۔۔محبت جوش مار رہی تھی۔

اٹھنا چاہا۔۔۔پاؤں میز کے ساتھ ٹکرائے۔اور یہ ٹکراؤ انہیں ہوش کی دنیا میں لے آیا۔جذبات جو مچل رہے تھے۔ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔۔۔۔

ہال میں بے تحاشا تالیاں گونج رہی تھیں۔۔۔۔سامنے دیکھا۔۔۔۔کس شان سے وہ کھڑا تھا۔حرکات میں تصنع اور بناوٹ نہ تھی ایک ایسی قدرتی بے ساختگی تھی جو اس کی پر کشش شخصیت کو حد درجہ جاذب نظر بنا رہی تھی۔خوبصورت آنکھوں میں جھانکتا غایت درجے کا اعتماد،باوقار آواز،مدلل انداز تقریر۔۔۔۔اس کے پاس ایک چھوٹی سی چٹ تھی۔۔۔۔کس روانی سے،کس شان سے وہ مخالفین کے پوائنٹ کاٹ رہا تھا۔بار بار تالیاں بج جاتیں۔۔۔۔وہ ایک ایسے دریا کی طرح تھا۔جس کی موجیں طوفان آشنا بھی ہوتی ہیں اور محو خرام ہونا بھی جانتی ہیں۔۔۔۔

تقریر ختم کر کے وہ جا چکا تھا۔

اف۔۔۔۔یہ عہدے۔۔۔۔یہ ذمہ داریاں۔۔۔۔یہ فرائض،کبھی کبھی کتنے بوجھل بن جاتے ہیں۔وہ چاہتے تھے ان حائل شدہ فاصلوں کو ایک ہی جست میں پھلانگ

کر وہاں پہنچ جائیں جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسے سینے سے چمٹالیں اور یوں وہ درد سکون پذیر ہو جائے جو انہیں بے حال کیے ہوئے ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔۔۔۔ نہ کر سکے۔

وقت کی تیز گردش کو شاید نیند آ گئی تھی۔ کس اذیت سے وہ چند گھنٹے گزارے۔ اس کا اندازہ انہیں زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا۔

نتائج کا اعلان کیا گیا۔ ثاقب کو اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ صدر نے اسے تعریف و تحسین کے بہترین الفاظ سے نوازا۔

چائے کے لئے اٹھا جا رہا تھا۔ ایک پل میں انہوں نے اس کے قریب پہنچ کر اس زور سے اسے اپنے سینے سے چمٹالیا جیسے گوشت کی بیرونی تہیں ہٹا کر وہ اسے خانہ دل میں بٹھالینا چاہتے ہوں۔ آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

"ثاقب!۔۔۔ میری زندگی، میری روح مجھے پہچانو میں کون ہوں۔۔۔ آہ میں تمہارا بدنصیب چچا ہوں۔۔۔"

وہ لمحہ جاودانی مسرت کا حامل تھا۔ اورنگ زیب اس کا محبوب چچا۔ ثاقب کے سمٹے ہوئے بازو کھلے۔ پھیلے اور چچا کی پشت سے چپک گئے۔

انہوں نے تہہ در تہہ جما دل کا غبار دھویا اور ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔ ثاقب نے مختصر الفاظ میں ساری داستان چچا کو سنا ڈالی۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ ان کے ساتھ کار میں بیٹھا ان کے گھر جا رہا تھا۔ کار پورچ میں رکی۔ ڈاکٹر اورنگ زیب سرعت سے باہر نکلے اور برآمدے میں سے ہی چلائے۔

"عصمہ! عصمہ!!۔۔۔ خدا کو ہماری حالت زار پر آخر رحم آ ہی گیا۔ باہر آؤ عصمہ!۔۔۔ دیکھو تو سہی کون آیا ہے؟"

عصمہ نے شوہر کی آواز سنی، تیزی سے باہر نکلیں۔ شوہر کے ساتھ ایک خوبصورت

نوجوان کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔۔

"ہمایوں بھائی۔۔۔۔!" بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔۔۔۔

"عصمی! اپنے ثاقب سے ملو۔"

اور اگلے ہی لمحے وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ چکی تھیں۔اس کے بالوں، پیشانی، رخساروں، گردن کون سی جگہ تھی جہاں انہوں نے پیار نہ کیا ہو۔موٹے موٹے آنسو ان کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ثاقب کا دامن بھگو رہے تھے۔

یہ شور و غوغا اور غیر معمولی ہنگامہ تیرہ سالہ ارم، گیارہ سالہ نجم اور نو سالہ سہیل کو کمرے سے باہر نکال لایا تھا۔

وہ سب دم بخود کھڑے تھے۔

"یہ تمہارا پیارا بھائی، ثاقب ہے۔" اورنگ زیب نے بچوں کو مخاطب کیا۔

بچوں کے لئے ثاقب کوئی نئی شخصیت نہ تھی۔ماں باپ کے چہروں پر کبھی کبھی گہری اداسی انہیں فوراً سمجھا دیا کرتی کہ وہ کس کے لئے اداس ہیں؟ کس کے لئے مضطرب ہیں۔۔۔۔اور کس کے لئے تڑپتے ہیں؟

سوائے ارم کے دونوں بچے ثاقب سے چمٹ گئے۔

اور ڈیڑھ گھنٹہ بعد ان کی کار ملتان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

رات کے ایک بجے ثاقب نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔رفعت نے دروازہ کھولا۔۔۔۔اور ثاقب کو دیکھ کر اسے سینے سے لگایا۔۔۔۔

"امی جان!۔۔۔۔میں آپ کے لئے ڈھیروں خوشیاں لایا ہوں کہ آپ کا دامن شاید انہیں سہار بھی نہ سکے۔۔۔۔میں آپ کے لئے روشن سحر لے کر آیا ہوں امی جان!۔۔۔۔"

ابھی رفعت کچھ کہنے نہ پائی تھیں کہ اورنگ زیب، عصمہ اور بچے اندر آ گئے ۔

ان پر نظر پڑی تو چلا اٹھیں۔۔۔۔

"ثاقب! میں خواب دیکھ رہی ہوں۔"

"نہیں رفی آپا!۔۔۔۔یہ خواب نہیں۔۔۔۔عین حقیقت ہے۔۔۔۔"

عصمہ اور اورنگ زیب دونوں بڑھے اور ان سے لپٹ گئے۔کتنے اشک بہے، کتنی آہوں نے دم توڑا۔۔۔۔اور پھر وہ ہجر و وصال اور اندوگیں غم کی کہانیاں ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔

اندھیرے چھٹ گئے تھے۔تاریک رات دم توڑ گئی تھی اور روشن سحر طلوع ہو چکی تھی۔

باب نمبر:۲۱

دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھے وہ مخملیں گھاس کے فرش پر چت لیٹی ہوئی تھی۔نگاہیں بظاہر سامنے درخت کے موٹے تنے پر مرکوز تھیں۔لیکن دماغ سوچوں کے بھنور میں الجھا ہوا تھا۔خوب صورت آنکھیں بے چینی کی غماز تھیں۔مرمریں پیشانی پر کبھی کبھی کوئی شکن اور بھنوؤں کی درمیانی جگہ کا مخصوص انداز میں کبھی کبھی پھیلاؤ،اس کے قلبی ہیجانات کی واضح انداز میں عکاسی کر رہا تھا۔

یہ ذہنی تفکر اور چہرے پر پھیلی گہری سوچ و بچار کی کیفیات اس لاابالی،کھلنڈری،شوخ اور لاپرواہ لڑکی پر کچھ عجیب سی محسوس ہو رہی تھیں۔۔۔۔وہ تو غم امروز و فکر فردا سے بے نیاز تھی۔۔۔۔اکلوتی بیٹی ہونے کی حیثیت سے گھر بھر اس کے ناز اٹھاتا تھا۔۔۔۔والدین کی بے پناہ پیار و التفات نے اسے کسی حد تک ضدی اور خودسر بنادیا تھا۔۔۔۔ذرا سی بات مزاج کے خلاف ہوئی اور اس کا پارہ چڑھا۔۔۔۔وہ ہر فرد کی خصوصی توجہ چاہتی تھی۔

لیکن گزشتہ چند دنوں سے گھر بھر کے غیر معمولی پیار میں قدرے کمی آ گئی تھی۔اور یہ ایک ایسی چیز تھی جس نے اسے برانگیختہ کر دیا تھا۔وہ اس کمی کے سبب کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

گھر میں ثاقب کی آمد اس کے لئے سخت ذہنی الجھن کا باعث بن گئی تھی۔

ہر بات میں اسے غیر معمولی اہمیت دی جا رہی تھی۔

پہلے چند روز تو اس نے خیال ہی نہ کیا۔سب کے ساتھ وہ خود بھی بہت خوش تھی۔رفعت کا بے پناہ پیار اس کے لئے مسرت کا حامل تھا۔لیکن آہستہ آہستہ یہ مسرت کافور ہوتی گئی۔۔۔۔خوشی کا نشہ اترتا گیا۔

کتنی ہی وجوہات تھی۔

ساری کوٹھی میں اس کا کمرہ بہترین تھا۔ڈاکٹر صاحب نے جب اسے وہ کمرہ ثاقب کیلئے خالی کرنے کو کہا۔چند لمحوں کے لئے وہ حیران ہی تو رہ گئی۔۔۔۔یہ کمرہ تو اس نے پچھلے سال اپنے ضیاء ماموں کی منتیں کرنے پر بھی ان کے لئے خالی نہ کیا تھا۔ابو اس بات سے آگاہ ہیں۔۔۔۔وہ جانتے ہیں کہ اپنا کمرہ مجھے کتنا عزیز ہے۔۔۔۔سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔۔۔۔میری دلی کیفیات سے آگاہ ہوتے بھی انہوں نے یہ بات کیوں کہی؟

وہ گنگ سی ہو گئی۔۔۔۔تبھی اسے ڈاکٹر صاحب کی آواز سنائی دی۔

"ارم بیٹے!۔۔۔۔وہ کمرہ آج شام تک خالی ہو جانا چاہیے۔"

"نہیں ابو میں وہ کمرہ ثاقب بھائی کو نہیں دوں گی۔۔۔"اس نے چیخ کر کہا۔

انہوں نے اسے سمجھایا۔۔۔۔کہ وہ باہر کی طرف ہے اور ان کے کمرے کے ساتھ ہے۔لیکن اس نے ان کی ہر بات کو رد کر دیا۔۔۔۔اور اس کی ہٹ دھرمی پر نہ صرف ڈاکٹر صاحب نے ناراضگی کا اظہار کیا بلکہ عصمہ نے بھی ڈانٹ پلائی۔

کمرے پر تو وہ قابض رہی ۔لیکن صحیح معنوں میں پہلی بار ابو اور امی کی ناراضگی محسوس کرتے ہوئے جل اٹھی ۔ثاقب سے اسے شدید جلن محسوس ہوئی۔

اور پھر اس واقعہ کے بعد بھی متعدد باتیں ایسی ہوئیں جو اس کے پندار کو بری طرح مجروح کر گئیں۔

گھر میں کھانا پکاتے وقت اس کی پسند کا خاص خیال رکھا جاتا ۔لیکن اب صورتحال بدل چکی تھی ۔اس کی پسند سے کہیں زیادہ ثاقب کی پسند کا خیال رکھا جاتا ۔۔۔۔کھانے کی میز پر کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی دیکھنے میں آتیں جنہیں عام حالات میں وہ کبھی گوارا نہ کرتی اور شاید ڈونگے سمیت فرش پر پٹخ دیتی ۔لیکن چونکہ وہ ثاقب کی من پسند ہوتیں اس لئے انہیں میز کی زینت بنایا جاتا ۔اور وہ جلنے کڑھنے کے سوا کچھ نہ کر پاتی ۔

گھر کا ہر فرد اب ثاقب کی نازبرداریوں میں لگا رہتا تھا ۔امی اس کی دلداریاں کرتے نہ تھکتیں ۔ابو اس سے پیار بھری باتیں کرتے نہ اکتاتے ۔۔۔۔اور اس کے چھوٹے بھائی ہمہ وقت اس سے چمٹے رہتے ۔

ناشتے کے وقت اگر اسے آنے میں دیر ہو جاتی تو گھر کا کوئی فرد کھانے کی کسی چیز کو نہ چھوتا ۔۔۔۔اس کا انتظار کیا جاتا ۔ایسا تو کبھی اس کے لئے بھی نہیں کیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس کے ابو کی آنکھیں کیسے خوشی سے جگمگاتیں ۔کتنا پیار ان آنکھوں میں ثاقب کے لئے مچلتا ۔۔۔۔اور کچھ ایسا ہی حال عصمہ کا بھی تھا۔

وہ سلگ اٹھتی ۔جل جل جاتی ۔۔۔بس نہ چلتا تھا ۔وگرنہ جانے کیا کر ڈالتی ۔۔۔۔ایک بڑا ذہنی عذاب اس کے لئے رفعت تھیں ۔۔۔۔رفعت جو اسے روح کی عمیق گہرائیوں سے پیار کرتیں ۔سارا دن اس کے ہنگاموں میں گزار دیتیں ۔

ضمیر اسے ثاقب کے متعلق خیالات پر نفرین کرتا۔وہ پریشان ہو جاتی ۔لیکن یہ سب باتیں اس کی برداشت سے باہر تھیں۔انہیں نظر انداز کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

اور اس حسین شام سبز گھاس پر لیٹی وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھی کہ بہت سے شوخ شوخ قہقہے اس کے کانوں سے ٹکرائے۔تیزی سے وہ اٹھ بیٹھی۔پلٹ کر دیکھا تو ثاقب،نجم اور سہیل کے ساتھ کھیل رہا تھا۔چاکلیٹی رنگ کی جرسی اور گرے پینٹ میں وہ بہت سمارٹ نظر آ رہا تھا۔شہزادوں جیسی آن بان اور وقار اس کے چہرے سے ٹپک رہا تھا۔چند لمحوں تو وہ بغور اسے دیکھتی رہی۔نفرت کے جذبات پوری شدت سے اس کے دل میں ابھرے اور اگلے ہی لمحے اس کی بھنویں تن سی گئیں۔

"ارم!۔۔۔۔آیئے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔" ثاقب اس کے قریب آکر خوش دلی سے مسکرایا۔

''شکریہ!۔۔۔۔میرے سر میں درد ہے۔'' ناگواری سے اس نے ہونٹ سکیڑے۔

"بھائی جان!۔۔۔۔باجی آپ کے ساتھ اس لئے نہیں کھیلتیں کہ وہ ہار سے خوفزدہ ہیں۔"

"نجم!۔۔۔۔"وہ غصے سے چیخی۔

"آؤ نا ارم!۔۔۔۔ایک بازی کیوں نہ ہو جائے۔" ثاقب ریکٹ گھماتا ہوا ابھی تک شوخی سے مسکرا رہا تھا۔

یہ مسکراہٹ اسے جلا گئی۔۔۔۔جسم کو تیز جھٹکا دیتے ہوئے وہ اٹھی اور ریکٹ نجم کے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے تیزی سے کورٹ کی طرف بڑھی۔

یہ اس کے لئے ایک کھلا چیلنج تھا۔وہ اس کا جواب دینا چاہتی تھی۔آخر وہ بیڈمنٹن

کی مانی ہوئی کھلاڑی تھی۔

کھیل شروع ہوا۔۔۔۔وہ اچھا کھیلنے والی ضرور تھی۔لیکن ثاقب کے مقابلے کی ہرگز نہ تھی۔۔۔۔چار پوائنٹ سے ہار گئی۔نجم اور سہیل نے خوب خوب تالیاں بجائیں۔کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق وہ دونوں بھائیوں پر ٹوٹ پڑی۔مارنے کے لئے ان پر جھپٹی تو بچے قہقہے لگاتے ہوئے بھاگ گئے۔

"چچ چچ بری بات۔۔۔۔ہار کو بہادروں کی طرح برداشت کرتے ہیں ارم۔"

اس نے ارم کی حسین آنکھوں میں پل بھر کے لئے جھانکا۔

احساس شکست،ندامت کا سلگتا خیال اور حد درجہ شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔خونخوار نظروں سے اس نے ثاقب کو دیکھا۔بشاش چہرے پر دلفریب اور شگفتہ مسکراہٹ لئے وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔نگاہیں ملیں اور ثاقب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ایک لمحے کے لئے ارم نے اپنے خون میں لطیف سا ارتعاش محسوس کیا۔

لیکن اگلے ہی لمحے چبھن کا بھرپور احساس جاگ اٹھا۔۔۔۔شگفتہ مسکراہٹ دیکھ کر چہرے پر بیزاری کے آثار ابھر آئے۔منہ بناتے ہوئے پیشانی پر ہلکی ہلکی کتنی ہی شکنیں لئے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسی انداز میں کھڑا ثاقب اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ارم کو دیکھتے ہی اسے اپنی عزیز ترین ماں کی ڈھیروں تمنائیں،ڈھیروں خواہشات یاد آجاتیں۔۔۔تمناؤں کے وہ خواب جو ایک ماں بیٹے کی پیدائش سے لے کر اس کے جوان ہونے تک دیکھتی ہے۔ایسے کتنے ہی خواب اس کے حافظے میں محفوظ تھے۔ارم پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلتا تو اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے۔

"یہ ارم ہے،اتنی ضدی اور خودسر لڑکی،جسے بہو بنانے کی تمنا میری ماں کی سب

سے بڑی، اور آخری خواہش ہے۔" ثاقب نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

اس دن اتوار تھا۔ ثاقب، نجم اور سہیل کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے انہوں نے ارم کو دیکھا جو مطالعہ میں مصروف تھی۔

"ارم باجی!۔۔۔۔ہم ثاقب بھائی جان کی پینٹ کی ہوئی تصویریں دیکھنے جا رہے ہیں۔۔۔۔آپ بھی آیئے۔"

تصویریں وہ خود بھی بنایا کرتی تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ثاقب کیسی بناتے ہیں؟ وہ اٹھ کر ان کے ساتھ چل دی۔تصویریں دیکھیں، واقعی بہت محنت اور لگن سے بنائی گئی تھیں۔

شوخ شوخ رنگوں سے بنی ہوئی خوبصورت اور جوان عورتیں، لمبے لمبے گھنے درختوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی گھنی چھاؤں والی تصاویر، وہ بغور دیکھ رہی تھی۔

تبھی اسے بلند و بالا گھنے اور ٹھنڈی چھاؤں والے درختوں کے درمیان اچانک مئی جون کا تپتا سورج نکلتا دکھائی دیا۔۔۔۔چلچلاتی دھوپ نے اسے تڑپا کے رکھ دیا۔۔۔۔

ڈاکٹر صاحب اس کی تصویریں بہت پسند کرتے تھے اور اکثر اپنے دوستوں سے بھی تعریف کیا کرتے تھے۔

لیکن۔۔۔۔اب وہ حرف غلط کی طرح مٹ جائے گی۔۔۔اور ساری تعریفیں ثاقب کے لئے مخصوص ہو کر رہ جائیں گی۔۔۔

دل و دماغ کے کسی گوشے سے نفرت و بیزاری کی تند و تیز لہریں اٹھیں۔۔۔۔لاکھ دامن بچانا چاہا لیکن ان کی زد میں آ کر رہی۔

" کیسی تصویریں ہیں ارم؟۔۔۔۔" ثاقب اس سے مخاطب تھا۔

"بالکل تھرڈ کلاس۔۔۔۔یوں لگتا ہے جیسے آپ کو مصوری کی الف۔ب کا بھی پتہ

نہیں ---" جلے دل کے پھپھولے پھوٹ رہے تھے۔

"یہ تم نے کیا کہا ارم؟ ----" ثاقب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"آج کل کچھ فیشن ہی ہو گیا ہے ----بس ذرا آڑی ترچھی لکیریں کھینچنی کیا آ گئیں کہ خود کو بہت بڑا آرٹسٹ سمجھنا شروع کر دیا۔ آپ بھی شاید ایسی ہی خوش فہمی کا شکار ہیں ----"

ایسی تنقید اور تبصرے کے لئے کم از کم ثاقب ہرگز تیار نہ تھا۔ تصویریں حقیقتاً بہت اچھی تھیں ----وہ جانتا تھا طنز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر۔"

وہ دوسری طرف چلا گیا تھا۔

یہ مصرع اور طنزیہ انداز اسے کھولا کر رکھ گیا۔ وہ بل کھاتی غصے سے لہراتی پاؤں بیزاری سے پٹختی نیچے اتر رہی تھی۔ سامنے سے عصمہ آ رہی تھیں ----یوں ڈگ ڈگ کرتے اسے اترتے دیکھا تو کسی قدر غصے سے بولیں۔

"بچی تو نہیں ہو ارم! ----اب کچھ تمیز سیکھو۔"

غصہ تو پہلے ہی آ رہا تھا۔ ماں کی اس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا ---مگر وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی ----بس اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گئی۔

دوپہر کے کھانے پر سہیل اور نجم نے ارم کی تنقید باپ کو سنائی -----انہوں نے رات وہ تصاویر دیکھی تھیں۔ بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے حیرانی سے بولے۔

"ارم بیٹے! ----وہ تصویریں تو بہت عمدہ ہیں ----میں حیران ہوں تمہیں پسند کیوں نہیں آئیں؟"

"بندر کو ادرک کے ذائقے کی کیا تمیز ----" سہیل نے فقرہ کسا۔

ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔عصمہ اورڈاکٹر صاحب دل کھول کر ہنسے۔ثاقب بھی مسکرا دیا۔رفعت نے سہیل کو پیار بھری ڈانٹ پلائی۔

اس کے دل میں کیسے کیسے طوفان اٹھے؟یہ کسی کو خبر نہ تھی،وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ بیٹھی۔اور پھر باقاعدہ روٹھ گئی۔۔۔۔ماں نے منتیں کیں،باپ نے منایا اور رفعت نے تو منت سماجت کی حد کر دی۔اور بالآخر ان کے بے پناہ پیار کے سامنے اسے جھکنا ہی پڑا۔

باب نمبر:۲۲

گھر کی لاڈلی بیٹی کی سالگرہ ہر سال تزک واحتشام سے منائی جاتی۔اس بار بھی فروری کے آغاز سے گھر میں دبے دبے ہنگاموں نے جنم لیا تھا۔ارم کے انداز سے ایک شان تفاخر نمایاں تھی۔اس کا ذہن ہمہ وقت تقریب کی تیاریوں کے تصور میں مگن رہتا۔

لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں یہ تلخ احساس رچ بس گیا تھا کہ ثاقب اس گھر میں اس کی بے پناہ اہمیت پر اثر انداز ہوا ہے۔اب وہ اس پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ اس گھر میں اسے کتنا بلند مقام حاصل ہے؟یہی وہ احساس تھا۔جس نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

کس سرگرمی اور کس جوش وجذبے سے وہ کام کر رہی تھی۔لیکن گھر میں وقوع پذیر ہونے والے ایک چھوٹے سے حادثے نے اس کے سارے ولولوں کو سرد کر دیا۔۔۔۔ساری امنگوں کا خون کر دیا۔۔۔۔وہ دل شکستہ سی ہو کر رہ گئی۔بات معمولی تھی لیکن اس نے گہرا اثر قبول کیا۔

ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کسی قدر فخر وتکبر سے ثاقب کو دیکھا اور پھر ڈاکٹر

صاحب سے مخاطب ہوئی۔

"ابو! آپ نے انکل فریدی کو میری سالگرہ میں شمولیت کے لئے دعوت نامہ بھیج دیا ہے نا؟"

"بیٹے!۔۔۔۔وہ مصروف آدمی ہیں۔۔۔میرا خیال انہیں ثاقب کی سالگرہ پر بلانے کا ہے۔"

"میری سالگرہ پر؟۔۔۔۔" ثاقب بے اختیار ہنس دیا۔

"تم ہنسے کیوں ثاقب بیٹے؟ تمہاری سالگرہ شاندار طریقے سے منائی جائے گی۔عظیم الشان جشن ہوگا تاکہ ہمارے ملنے والوں کو علم ہو کہ ہمارا بچھڑا ہوا پیارا بیٹا ہمیں دوبارہ ملا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔آنکھیں نم تھیں۔۔۔۔عصمہ کی پیار بھری نظریں بھی ثاقب کے چہرے پر دوڑ رہی تھیں۔

لقمہ ارم کے منہ میں پھنس گیا تھا۔جسے نیچے اتارنا مشکل ہی نہیں ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔

غرور ایک ہی لمحے میں کچلا گیا تھا۔وہ شان۔۔۔وہ تفاخرانہ انداز جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب کے پیار میں ڈوبے ہوئے الفاظ کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر پڑ رہے تھے۔

"ہاں بیٹے! تمہاری سالگرہ کا جشن ایک یادگار جشن ہوگا۔اور ہر سال یہ تقریب اسی اہتمام سے منائی جائے گی۔" یہ عصمہ کی آواز تھی۔

آنکھیں جل اٹھیں۔۔۔۔چہرہ غصے کی حدت سے تمتما اٹھا۔خود پر قابو پانے کے لئے اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔۔۔۔

"میرا خیال ہے اب ارم کی سالگرہ کا سلسلہ ختم کر دینا چاہیے۔خاصی بڑی ہوگئی ہے۔"عصمہ، بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے قصداً مسکرائیں۔

تن بدن میں نفرت کی دہکتی آگ اب پوری شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔گلاس کو میز پر پٹختے ہوئے وہ غصے سے کھڑی ہوگئی، ماں کو دیکھتے ہوئے چلائی۔

"ہاں، ہاں! کیا ضرورت ہے؟۔۔۔۔مفت میں فضول خرچی ہی ہے۔"

"بیٹے وہ تو مذاق میں ایسا کہہ رہی ہے۔تم نے سچ سمجھ لیا ہے۔ایسا کبھی ہوسکتا ہے۔۔۔اپنی بیٹی کی سالگرہ میں مناؤں گی۔۔۔"رفعت نے اس کا تنا ہوا چہرہ اور خراب موڈ دیکھ کر دلداری کی۔۔۔۔

ایک ثانیہ کے لئے ثاقب نے اس کی طرف دیکھا اور دنگ سا رہ گیا۔۔۔۔وہاں نفرت کی گہری پرچھائیوں کے سائے رینگ رہے تھے۔

اس کا ذہن سلگ اٹھا۔۔۔سپنے گڈمڈ ہوتے نظر آئے۔عقل اس معمے کو حل کرنے سے قاصر تھی کہ بات بات میں۔۔۔قدم قدم پر ایسے توہین آمیز کلمات کا پس منظر کیا ہے۔۔۔وہ تو ارم سے دوستانہ تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا۔ارم اس کی غم زاد۔۔۔۔جس کی رگوں میں اس کا اپنا خون رواں تھا۔۔۔۔

کسی شکست خوردہ انسان کی طرح نڈھال ارم اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔

خوشیوں کے جگمگاتے کنول دھندلا سے گئے تھے۔

مسرتوں کو گہن لگ گیا تھا۔

وہ تڑپ رہی تھی۔جوش کھا رہی تھی۔۔۔۔ثاقب۔۔۔۔ثاقب۔۔۔۔ثاقب۔۔۔۔اس کا ذہن چیخا۔

''میں دیکھوں گی۔۔۔''اضطراری حالت میں اس کی مٹھیاں بھینچ

گئیں ۔۔۔۔جوش غضب سے اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔

اس نے میری محبت کو میرے گھر والوں کو چھین لیا ہے۔اس نے میرے پیار پر ڈاکہ ڈالا ہے۔

انتقامی حربے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔دماغ اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔

عین اسی لمحے رفعت کا چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے ابھرا۔رفعت "اور وہی چہرہ جو پَل بھر پیشتر غصے سے تنا ہوا تھا۔وہی آنکھیں جو چند منٹ قبل جنونی کیفیت کی غمازی کر رہی تھیں۔ان میں دکھ اور ہمدردی ابھر آئی ۔۔۔۔چہرہ اداس سا ہو گیا۔رفعت خود اسے کتنی محبوب تھی ۔۔۔۔اتنی پیاری اور من موہنی شخصیت والی جنھوں نے اسے شدید پیار دیا تھا۔۔۔۔جو اس کی صورت دیکھ کر جیتی تھیں ۔۔۔۔ثاقب ان کا بیٹا تھا۔اگر وہ ثاقب کو کچھ نقصان پہنچا بیٹھی تو تکلیف کسے ہوگی؟" سبھی کو۔۔۔۔"اس کے دل نے جواب دیا۔اس کی آنکھوں سے دل کا درد آنسوؤں کی صورت میں باہر نکلنے لگا۔۔۔

تبھی رفعت اس کے کمرے میں داخل ہوئیں ۔۔۔۔پیار سے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ان کی گود میں سر رکھے وہ کتنی دیر خالی الذہن لیٹی رہی۔

تقریب نزدیک آتی جا رہی تھی ۔۔۔لیکن وہ تو یکسر بجھ چکی تھی ۔۔۔۔ساری لگن ختم ہو گئی تھی۔

وہ اتنی ضدی اور خود سر لڑکی جو ذرا سی بات پر گھر والوں کو ناکوں چنے چبوا دیا کرتی۔اب خاموش تھی ۔۔۔۔اس خاموشی میں بے بسی تھی ۔۔۔۔اور یہ بے بسی صرف رفعت کی وجہ سے تھی وگرنہ شاید ایک پَل میں وہ گھر میں قیامت لے آتی ۔۔۔۔طوفان اٹھا دیتی ۔۔۔نتیجہ چاہے کچھ ہی ہوتا۔

سالگرہ میں ابھی تین چار دن باقی تھے کہ کرکٹ کے ایک میچ کے لئے ثاقب کو

دوسرے شہر جانا پڑا۔۔۔۔جانے سے قبل وہ اس کمرے میں گیا۔ارم کمرے میں موجود نہ تھی۔تحفہ جو ثاقب نے اسے سالگرہ پر دینے کے لئے خریدا تھا۔میز پر رکھ دیا اور خود باہر چلا آیا۔

ارم جب کمرے میں آئی اور میز پر پڑے پیکٹ کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔کھولا خوب صورت سا ایک بریسلیٹ اور پرفیوم۔چھوٹی سی چٹ بھی ساتھ چسپاں تھی۔

ارم کے لیے۔

ثاقب۔"

ایک لمحے کے لئے وہ سب کچھ بھول گئی۔

نفرت۔۔۔۔غصہ۔۔۔۔عداوت۔۔۔۔کچھ بھی تو یاد نہ رہا۔۔۔۔

ایک شاندار اور باوقار چہرہ پرخلوص مسکراہٹ لئے اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔دل میں لطیف لطیف دھڑکنوں کے مدوجزر پیدا ہوئے۔لیکن یہ حالت چند لمحوں تک ہی قائم رہی۔۔۔۔

خودنمائی کا سیاہ عفریت دندناتا ہوا آیا اور دل و دماغ پر چھائے لطیف احساسات کو نگلتا چلا گیا۔۔۔۔ہزیمت خوردہ انداز میں اس نے بل کھایا۔اور بریسلیٹ کو اٹھا کر فرش پر دے مارا۔

سالگرہ کا دن آیا۔کیسی خوشی؟ کیسا سرور؟ کیسی مسرت؟اس پر تو ایک بے نام سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ہر ہر حرکت سے گہرا اضطراب ٹپک رہا تھا۔

ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر اس کا دل ان سب کی مسکراہٹ چھین لینے کو چاہ رہا تھا۔جگمگاتے قمقموں سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔جی چاہتا تھا ان روشنیوں کو گل کر ڈالے ہر سو اندھیرا پھیل جائے۔اور پھر وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر سو جائے۔گہری

نیند۔۔۔۔کوئی غم اور تفکر اسے پریشان نہ کر سکے۔

باب نمبر:۲۳

دل و دماغ انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔نفرت کا زہر پورے وجود میں سرائیت کر گیا تھا۔۔۔۔روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی معمولی باتیں اب اس کی آنکھوں میں نوکیلے کانٹوں کی طرح کھٹکنے لگی تھیں۔صبر و قرار لٹ گیا تھا۔بے سکونی۔ذہنی انتشار۔اعصاب پر شدید گھبراہٹ اور الجھن ہمہ وقت کسی خوف ناک بھوت کی طرح اس پر سوار رہتی۔

اس کے اس الجھے الجھے رویے سے گھر کے سبھی افراد حیران تھے۔وہ زندہ دلی،وہ قہقہے،شوخیاں اور شرارتیں سبھی ختم ہو چکی تھیں۔پیشانی تنی رہتی۔۔۔۔ثاقب کی سالگرہ کا جشن اس کے رہے سہے ضبط کے پرخچے اڑا گیا۔اتنا عظیم الشان جشن۔۔۔۔ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے اپنے گھر میں ایسا ہنگامہ آج تک نہ دیکھا تھا۔سالگرہ کب معلوم ہوتی تھی۔

وسیع باغ کے ہر درخت کے پتوں میں چمکتے دمکتے بوٹوں میں روشنیاں بکھیرتے ہزاروں رنگین قمقمے۔صوفوں پر تمکنت سے بیٹھے معززین شہر کی بھاری تعداد،سفید وردیوں

والے لاتعداد ہیرے اور قیمتی لباس میں ملبوس ثاقب وجاہت، وقار، اور حُسن میں شہزادوں کو بھی مات کر رہا تھا۔

مدہم مدہم ہلکورے لیتی موسیقی تقریب کے حُسن کو اور بھی حسین بنا رہی تھی۔

لیکن ارم کے دل میں چتائیں جل رہی تھیں۔۔۔۔رقابت کی تیز آنچ وجود کو جھلسائے جا رہی تھی۔دل و جگر میں اتنی تاب کہاں تھی کہ ان نظاروں سے محظوظ ہو سکتی۔۔۔۔صبح ہی سے شدید سر درد کا بہانہ کیے بستر پر دراز تھی۔۔۔۔رفعت اس کے پاس تھیں۔ڈاکٹر صاحب آئے۔اور اسے دوا دے کر چلے گئے۔عصمہ بھی آئیں لیکن تھوڑی دیر کے لئے۔۔۔۔اور وہ بستر پر لیٹی کھول رہی تھی۔۔۔۔

رفعت تھوڑی دیر کے لئے باہر گئیں۔۔۔۔اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔۔۔۔دل و دماغ میں ابلتی کھولتی نفرت میں کچھ اور بھی تیزی آ گئی۔۔۔۔آنکھوں کا تناؤ کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

واپس آئی بکس میں سے پرفیوم اور پرسلیٹ نکالا۔۔۔۔انہیں پیک کیا اور نوکر کو ثاقب کے کمرے میں رکھنے کے لئے کہا۔

سالگرہ کا جشن ختم ہوا۔ثاقب اس کے کمرے میں آیا۔۔۔۔وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔کہ یکدم کسی کا ٹھنڈا ٹھنڈا ہاتھ اپنی پیشانی پر محسوس کرتے ہوئے اس نے۔۔۔۔آنکھیں کھول دیں۔

نگاہوں میں بے چینی اور دکھ کا احساس لئے، ثاقب اس پر جھکا ہوا تھا۔

کیسی طبیعت ہے ارم؟

وہ سلگ ہی تو اٹھی۔۔۔۔غصے سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی اور ناگواری سے بولی۔

"تکلیف فرمائی کا شکریہ۔ میں اب ٹھیک ہوں۔"

وہ سُن سا ہو گیا۔ حد درجہ سرد اور برفیلی لہریں اپنے تن بدن میں سرایت کرتی محسوس ہوئیں۔

یہ قدم قدم پر ناگواری۔۔۔ یہ بات بات پر بیزاری۔۔۔ اس کا پس منظر کیا ہے؟ کیا اسے ہمارا یہاں رہنا پسند نہیں۔ اس نے بے اختیار سوچا۔۔۔

اور یہ ایسا تلخ احساس تھا جس نے اسے تڑپا کر رکھ دیا۔ بوجھل قدموں سے وہ مڑا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔۔۔ آج کی تقریب میں جو اسے ڈھیروں خوشیاں ملی تھیں ان سب پر اوس پڑ گئی تھی۔۔۔ اس کی نگاہوں سے قلبی پریشانی مترشح تھی۔۔۔

میز کی طرف نگاہ گئی۔ پیکٹ پڑا دیکھا قریب جا کر کھولا اُس کا تحفہ کیا ہوا بریسلیٹ اور پرفیوم ہاتھوں میں آ گیا۔ چھوٹی سی ایک چٹ اس کے خلوص کے منہ پر طمانچے مار رہی تھی۔

''مجھے تحائف کی قطعاً خواہش نہیں۔ اور نہ ایسی چیزوں کی میرے پاس کمی ہے۔ شکریے کے ساتھ اس کی واپسی منظور فرمایئے۔

''ارم''

''ارم'' اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ اور اس نے اپنے بازوؤں میں اپنا منہ چھپا لیا۔

تم کتنی خودغرض ہو ارم۔ ہم نے زندگی میں کتنی ٹھوکریں کھائیں۔ کتنا دربدر ہوئے۔ تمہیں اس کا ذرہ سا احساس نہیں۔ اس لیئے کہ تم نے شیشے کے گھر میں پرورش پائی۔ ہماری طرح سڑکوں گلیوں میں رُلتیں بادِ سموم کے تھپیڑے کھاتیں تب جانتیں کہ زندگی ہوتی کیا ہے؟

تمہیں کس صف میں شمار کروں ۔اس نفرت کو کیا نام دوں ۔آہ!۔۔تم نے کچھ تو سوچا ہوتا ۔یہ طمانچہ جو تم نے میرے رخسار پر لگایا ہے ۔دل میں کتنے گہرے گھاؤ پیدا کر دے گا۔میری ماں کے قلب کی گہرائیوں میں تو ایک پل کے لیے جھانک لیا ہوتا ۔وہاں کتنی حسین تمنائیں تمہارے وجود سے وابستہ ہیں ۔تمہیں ان کا خون کرتے کچھ خیال نہ آیا۔۔ہم کہاں جائیں؟ خوشیوں کے پھول ملے لیکن کانٹوں کے ساتھ۔

وہ بے حد اداس تھا۔آنکھوں میں آنسو تھے ۔ہونٹ کرب سے سفید ہو رہے تھے ۔ شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے وہ لیٹ گیا ۔تبھی رفعت کمرے میں داخل ہوئیں ۔

بیٹے کی آنکھیں بند دیکھ کر اس پر جھک گئیں ۔پیشانی پر طویل پیار کیا ۔ثاقب نے آنکھیں کھول دیں ۔

''بیٹے ! تم ارم کو دیکھنے نہیں گئے؟''

اس کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر کہہ دے ۔امی! آپ سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہیں ۔امی واپس لوٹ جایئے ۔یہاں آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔آپ کے خوابوں کی تعبیر بڑی ہولناک ہے ۔اسے آپ کے لخت جگر سے نفرت ہے ۔

لیکن وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکا ۔آہستگی سے ''جی ہاں! ابھی دیکھ کر آیا ہوں ۔'' کہنے پر ہی اکتفا کیا ۔

رفعت کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہیں اور پھر چلی گئیں ۔بستر پر لیٹنا اس کے لیے عذاب بن گیا تھا ۔یوں لگتا تھا جیسے اس پر کانٹے بچھا دیئے گئے ہوں ۔بے قرار ہو کر وہ اُٹھ بیٹھا ۔

دماغ کڑوے کسیلے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ۔

وہ کیا کرے؟ کہاں چلا جائے؟

دماغ الجھ الجھ کر بے کار ہو گیا تھا۔ آنکھیں شدت احساس سے تپ رہی تھیں۔ وہ باہر نکل آیا۔ باغ کی روشوں پر ٹہلتا رہا۔ زخمی دل و دماغ کے ساتھ گھومتا رہا لیکن اسے سکون نہ مل سکا۔ اضطراب کم نہ ہو سکا۔ تڑپ کی شدت میں کمی نہ ہو سکی۔ اس نے سر گھاس پر رکھ دیا۔ تنکے توڑ توڑ کر آنکھوں سے لگائے لیکن وہ جلن مدہم نہ ہوئی۔

رات کے تیسرے پہر وہ قدرے سکون پذیر ہو گیا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے گا جب چوٹ لگے گی۔ تکلیف ہوگی۔۔ تڑپے گی تو محسوس ہوگا کہ کسی سے نفرت کیسے کی جاتی ہے؟ اور وہ بھی اپنے خون سے۔

اس واقعہ کو خاصے دن گزر گئے۔۔ ایک نمایاں چیز جو ارم نے محسوس کی وہ ثاقب کا رویہ تھا۔ سخت سخت سا، سہیل اور نجم کے سامنے وہ کبھی کبھی طنز کا گہرا تیر چلا دیتا۔

اس دن کالج سے ارم کے نتیجے کی رپورٹ آئی۔ وہ فزکس میں فیل تھی اور کیمسٹری میں بس فیل ہونے سے بچ گئی تھی۔ رات کے کھانے پر ڈاکٹر صاحب نے رپورٹ دیکھتے ہوئے تشویشناک انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔

''اگر تمہارا یہ حال ہے تو مجھے امید نہیں کہ تم ایف۔ ایس۔ سی بھی کر سکو۔ میڈیکل کرنا تو خیر بہت ہی مشکل بات ہے۔''

اس کے نمبروں کو دیکھتے ہوئے عصمہ تو بھڑک اُٹھیں۔

''نازو انداز زمانے بھر سے نرالے ہیں اور پڑھنے میں یہ حال۔''

ثاقب کے سامنے یہ سکی۔۔۔ ایسے توہین آمیز کلمات۔۔۔ وہ تو کٹ سی گئی۔ غصے سے سرخ ہوتی ہوئی میز سے اُٹھنے لگی تھی کہ باپ کی گونج دار آواز سن کر بیٹھ گئی۔

''بری بات۔ آخر محنت کیوں نہیں کرتی ہو؟''

''تم دونوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔کوئی بات نہیں ۔ابھی بچی ہے ٹھیک ہو جائے گی ۔ثاقب تم ارم کو پڑھنے میں مدد دیا کرو۔'' رفعت نے بیٹے سے کہا۔

''ہاں ثاقب بیٹے اپنے وقت میں سے تھوڑا سا وقت اسے دیا کرو۔'' عصمہ نے کہا۔

اور ارم ۔۔۔۔وہ تو پیچ و تاب کھا رہی تھی۔جی چاہتا تھا ساری میز ایک پل میں اُلٹ پلٹ کر دے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

اگلے دن شام کو وہ لان میں بیٹھی ہوئی تھی ۔جب اس نے ثاقب کو اپنی طرف آتے دیکھا۔اس پر نظر پڑتے ہی اس کی بھنویں تن سی گئیں۔

ثاقب قریب آگیا۔چہرے پر سختی تھی۔

''مجھے تمہیں پڑھانے کے لئے کہا گیا ہے ۔لیکن تم جیسی کوڑھ مغز اور بد دماغ لڑکی نے مجھ سے کیا پڑھنا ہے۔تمہارا تو پلے ہی کچھ نہیں پڑے گا۔'' وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔

''یہ بات مجھ سے کہنے کی بجائے ابو سے کہیے۔'' وہ چیخی۔

''میری بجائے تم زیادہ بہتر طریقے سے انہیں کہہ سکتی ہو۔'' اس نے جاتے جاتے نفرت سے بھرپور نظر اس پر ڈالی۔

اور ابو سے کہنے کا سوال ہی نہ تھا۔وہ کیسے کہہ سکتی تھی؟اس کی حرکات طشت از بام نہ ہو جاتیں۔

باب نمبر:۲۴

رات کے آٹھ بج رہے تھے رفعت اضطراری حالت میں باورچی خانے کی طرف بڑھیں اور مضطرب آواز میں عصمہ سے مخاطب ہوئیں جو اس وقت رات کے کھانے کے لیے خانساماں کے ساتھ مل کر کچھ تیار کر رہی تھیں۔

''عصمی! آٹھ بج رہے ہیں۔۔ارم پریشان ہو رہی ہوگی۔''

''رفی آپا! آپ مت گھبرایئے وہ اپنی کسی دوست کی گاڑی پر آجائے گی۔''
عصمہ نے انہیں پریشان دیکھتے ہوئے تسلی دی۔

لیکن رفعت بھلا کہاں مطمئن ہوتیں؟ کار گیراج میں موجود تھی۔لیکن چلانے والا کوئی نہ تھا۔ثاقب گھر پر نہیں تھا اور ڈرائیور بڑی گاڑی میں ڈاکٹر صاحب کو لینے گیا ہوا تھا۔ مغربی برآمدے میں آئیں۔سامنے سے ثاقب آتا دکھائی دیا۔اس کی طرف تیزی سے بھاگیں۔

''بیٹے! آج ارم کے کالج میں کوئی فنکشن ہے۔وہ گاڑی کا انتظار کر رہی ہوگی۔

جاؤ ذرا اسے لے آؤ۔''

''امی میں بہت تھک چکا ہوں ۔فکر نہ کیجیے وہ خود ہی آ جائے گی۔'' اس نے جان چھڑانی چاہی۔

''ثاقب!۔۔۔'' انہوں نے خفگی سے اسے گھورا۔

''بہتر! میں جاتا ہوں۔'' وہ گیراج کی طرف مڑ گیا۔وہ تو اسے آگ میں چھلانگ لگانے کو کہتیں تو بھی اُس سے انکار نہ ہوتا۔یہاں تو فقط ارم کو لانے کا معاملہ تھا۔اپنی ماں سے وہ پرستش کی حد تک پیار کرتا تھا۔آخر کیوں نہ کرتا وہ ماں بھی تو عظیم تھیں۔

کالج کے گیٹ کے ایک طرف اس نے گاڑی روک دی۔پروگرام شاید ختم ہو چکا تھا لڑکیاں جا رہی تھیں۔

اُس کی متلاشی نظروں نے ارم کو فوراً ہی ڈھونڈ لیا جس کی متجسس نگاہیں ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔کار کی ہیڈ لائٹس میں وہ اس حسین سراپے کو دیکھ رہا تھا جو گہرے پنک رنگ کے لباس میں ملبوس اندھیرے میں حسن کے جلوے بکھیر رہا تھا۔حسین آنکھوں میں مچلتی بے چین کیفیت سے وہ بہت محظوظ ہوا۔اشتیاق سے سٹیرنگ پر ہاتھ پھیلائے وہ اس کی بے چینی سے لطف اُٹھا رہا تھا کہ ارم کی نظر کار پر پڑی۔

یک دم اس کا چہرہ تن سا گیا۔غصے کے ہلکے ہلکے عکس لہرا گئے۔قدموں کو تیزی سے اُٹھاتے ہوئے وہ کار کی طرف بڑھی۔اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ثاقب بھی ہوش میں آ گیا۔وہ بھول گیا تھا۔۔کہ ارم اس سے نفرت کرتی ہے۔شدید نفرت اور تلخی احساس نے اس کے نرم نرم چہرے پر کرختگی کے آثار نمایاں کر دیئے تھے۔

کار کے قریب آ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔اور دوسرے ہی لمحے تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے رعونت سے بولی۔

''آپ؟۔۔ ڈرائیور کہاں ہے؟''

''جی ۔۔کہئے کچھ اعتراض ہے آپ کو؟'' ثاقب نے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔

''یہ وقت ہے آنے کا۔۔گھر والے کیا سو رہے ہیں؟''

''گستاخی معاف! یہ آنکھیں ہیں یا بٹن جنہیں آدھ گھنٹے سے گاڑی نظر نہ آ سکی۔۔۔'' ثاقب نے زیرِلب تبسم سے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

وہ تلملائی۔

''آپ کیوں آئے ہیں؟۔۔''

''آیا نہیں۔زبردستی بھیجا گیا ہوں۔'' ثاقب کی مسکراہٹ میں زمانے بھر کا طنز چھپا ہوا تھا۔

وہ مزید ایک لفظ بھی نہ بول سکی،اور چہرے پر کوفت اور بیزاری لیے ونڈ سکرین سے باہر فضا کو گھورتی رہی۔

کار کوٹھی کے برآمدے میں پہنچ کر رک گئی۔رفعت تیزی سے بھاگتی آئیں۔ارم باہر نکلی اور ان کے سینے سے چمٹ گئی۔

''میری چاند! ڈرائیور تمہارے ابو کو لینے چلا گیا تھا اور ثاقب بہت دیر سے آیا۔تم پریشان تو نہیں ہوئیں۔''

''بالکل نہیں۔ آیئے اب چلیں۔''

اس کی ماں سے ارم کا اتنا گہرا پیار۔۔۔۔فی الواقع یہ بات اس کے لیے انتہائی حیرانی کا باعث تھی۔

خاصے دن گزر گئے۔اس دن ناشتہ کرتے ہوئے اسے پتہ چلا کہ ارم کو تیز بخار

ہے وہ کالج چلا گیا۔ شام ڈھلے واپس آیا تو مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے امتحان قریب تھے۔

رفعت کمرے میں داخل ہوئیں۔

''ثاقب! تم سے ایسی لاپرواہی کی توقع نہ تھی۔ سارا دن گزر گیا اور تم ارم کو دیکھنے کے لیے نہیں آئے۔ یہ کتنی بری بات ہے؟''

''مجھے افسوس ہے امی جان۔ میں یہ کام ختم کرنے کے بعد اسے دیکھنے کے لیے جانے ہی والا تھا۔''

''یہ کام اتنا ضروری نہیں۔ اسے ایک سو چار سے اوپر بخار ہے۔''

''میں شرمندہ ہوں۔ مجھے علم نہ تھا امی جان!'' اس نے شائستگی سے معذرت کی۔

جب وہ ارم کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں گھر کے سبھی افراد موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب اسے انجکشن لگا رہے تھے۔ اور خاصے پریشان نظر آتے تھے۔ عصمہ کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا۔ اور اپنی ماں کی بے کلی کو وہ بخوبی سمجھتا تھا۔

لمبی لمبی گھنی پلکوں تلے بے حد چمکدار شوخ، سیاہ پتلیوں والی خوبصورت آنکھیں جن میں وہ اپنے لیے بیزاری، غصہ اور نفرت سی محسوس کیا کرتا تھا۔ اب بند تھیں۔ خوبصورت تراشیدہ ہونٹ سختی سے ایک دوسرے کے ساتھ چسپاں تھے۔ چہرہ بخار کی حدت سے تمتما رہا تھا۔

اتنے پیارے اور عزیز لوگوں کی یہ بے چینی اور تفکر۔۔ اس لمحے یہ احساس اسے اتنا عجیب محسوس ہوا کہ وہ ارم سے کبھی نفرت بھی کر سکتا ہے۔

''نہیں۔۔ ہرگز نہیں۔'' اس کے دل نے آواز دی۔ اپنے خون سے بھی کبھی

کوئی نفرت کرسکتا ہے۔ بوجھل دماغ کو اس خیال سے قدرے آسودگی محسوس ہوئی۔

رات کے ایک بجے رفعت نے اورنگزیب اور عصمہ کو زبردستی آرام کے لیے بھیج دیا۔ ثاقب کورس کی کتابیں وہیں اُٹھا لایا۔ دو گھنٹے بعد رفعت اسے دوا دے رہی تھیں۔ تقریباً تین بجے ثاقب نے انہیں دوسرے بستر پر لٹا دیا۔ اچانک ارم نے آنکھیں کھولیں۔

''پانی۔۔'' شکستہ آواز میں اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

ثاقب نے گلوکوز پانی میں حل کیا اور چمچ سے اس کے منہ میں ڈالنے لگا۔ دو تین گھونٹ اس کے حلق کے اندر گئے ہوں گے کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے اوپر ثاقب کو جھکا دیکھ کر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''آپ؟۔۔۔۔''

جانے ثاقب کو کیا محسوس ہوا؟ وہ خوشگوار سے احساسات جو کچھ دیر قبل اس کے ذہن میں پیدا ہوئے تھے یک دم ختم ہو گئے۔ تلخ احساسات اس کے دماغ میں ایک بار پھر کلبلانے لگے۔

''اتنی شدید نفرت۔ آخر کس جرم کی پاداش میں کی جا رہی ہے؟'' وہ بے اختیار سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

ایسا سوچنے میں کسی حد تک وہ حق بجانب ہی تھا۔ بخار سے وہ تقریباً بے ہوش تھی۔ لیکن اس بے ہوشی میں بھی نفرت کے اظہار کے لیے اس کا ذہن بیدار تھا۔

اس پر دوبارہ بخار کی غنودگی طاری ہو گئی۔

ثاقب کا ذہن جل اُٹھا تھا۔ کھڑا ہو گیا۔ رفعت سو نہیں رہی تھیں۔ اسے کھڑے دیکھ کر ارم کے پاس آ گئیں اور وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ ارم کی اس قدر شدید

بیزاری کا سبب کیا ہے؟ وہ یہ معمہ حل کرنے سے قاصر تھا۔

اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''آہ ارم!۔۔زخم کیا پہلے کم گہرے ہیں جو تم نشتر چبھو کر اور زیادہ گہرے کر رہی ہو۔میں نے خود پر جبر کر کے بھرپور چوٹیں بھی لگائیں ۔طنز کے تیر پھینک کر زخموں کی تڑپ کو آسودگی بھی دینا چاہی۔اس لیے کہ اسے احساس ہو جب چوٹ لگتی ہے تو قلب وجگر اس تکلیف سے کتنا گہرا اثر لیتے ہیں۔روح میں کیسا درد محسوس ہوتا ہے؟ لیکن پتھر پگھل نہ سکا۔''

اس کی نگاہوں میں گہری اداسی تھی۔

بے بسی کا مجروح سنپولیا اپنا زہر دھیرے دھیرے اس کے اندر منتقل کرتا جا رہا تھا۔

خوبصورت چہرے پر رعونت اور سختی اُبھری تھی۔

''میں اس کے سامنے کبھی نہیں جھکوں گا۔وہ اگر مجھ سے نفرت کرتی ہے تو میں بھی اس سے نفرت کروں گا۔''

ایسی شدید نفرت۔۔۔۔جو ہر چیز جلا کر بھسم کر ڈالے گی۔''

اور اس کے بعد وہ اسے دیکھنے کے لیے نہیں گیا۔ایک دو دن بعد اس کا بخار بھی کم ہو گیا تھا۔ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کی۔

رفعت نے ایک دو بار اس سے پوچھا بھی لیکن اس نے یہ کہہ کر انہیں ٹال دیا کہ میں اسے دیکھنے گیا تھا آپ شاید باہر تھیں۔

تقریباً ایک ہفتے بعد وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔چہرے پر جلال کی آب و تاب تھی۔

کمرے میں ارم تنہا تھی۔گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز وہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھی۔رخساروں کی سرخی پیلاہٹ میں بدلی ہوئی تھی لیکن حسن ہر رنگ میں حسین تھا۔

وہ اس انداز میں بھی دلفریب نظر آ رہی تھی۔

ثاقب کو دیکھ کر وہ خلاف معمول پر سکون رہی۔ چہرے سے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

دونوں ہاتھوں کو پشت پر رکھے وہ کس شان سے دیواروں پر لگی تصاویر کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ یوں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

ارم حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

آخری تصویر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور ایسے لہجے میں جس میں نرمی کے ساتھ ساتھ تلوار کی سی کاٹ تھی، بولا۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آرٹ کے یہ نادر شاہکار آپ کے ان ماہر ہاتھوں کا نتیجہ ہیں شاید۔۔''

اس کی آنکھوں سے تمسخر یوں اچھل اچھل پڑ رہا تھا جیسے کسی بھرے پیانے سے شراب۔

''ثاقب!'' عصمہ نے پکارا۔ اور وہ تیز تیز قدموں سے اسی وقت باہر نکل گیا۔

ارم نے چند بار حیرانی سے پلکیں جھپکائیں اور پھر سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

باب نمبر:۲۵

ارم کے بڑے ماموں نعیم کے بچے رومی، روحی اور احسن آج کل کاشانہ اورنگزیب کی رونق میں اضافے کا باعث بنے ہوئے تھے۔رومی ارم سے ایک سال چھوٹی تھی۔گندمی رنگت پر دلکش نقوش لیے یہ معصوم سی لڑکی بہت پیاری لگتی تھی۔

قدرت نے ثاقب کو ایک سنہری موقعہ فراہم کر دیا تھا۔اس کی انتقامی حس پورے طور پر بیدار ہو چکی تھی۔وہ ارم کے دل و دماغ پر جوابی ردعمل کے بھرپور چرکے لگانا چاہتا تھا۔ بی۔ایس۔سی کے امتحان سے وہ فارغ ہو چکا تھا اور آج کل رومی سے اس کی گاڑی چھن رہی تھی۔کھیلوں میں اس کی پارٹنر رومی، اس کی گفتگو کا مرکز رومی، اس کی صبح اور شام کی سیر بھی رومی کے ساتھ ہوتی۔ہمہ وقت وہ ارم کو نظر انداز کیے رکھتا۔نجم اور سہیل تو اس کے گرویدہ تھے ہی رومی، روحی اور احسن بھی اس کی پرکشش شخصیت اور بے پایاں خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔تینوں بہن بھائی اس کے زبردست مداح بن چکے تھے۔

لیکن رومی کی طرف ثاقب کے اس قدر التفات نے ارم کو بوکھلا دیا۔وہ اپنے

خیالات کی تبدیلی پر حیران ہو اُٹھی۔سراسیمہ انداز میں اس نے اپنے قلب میں جھانکا۔ کڑے طریقے سے خیالات کا تجزیہ کیا اور سینے میں مچلتی خواہشات کو محسوس کرتے ہوئے وہ گھبرا اُٹھی۔

''یہ سب کیا ہے۔۔۔؟'' وہ پاگل ہو رہی تھی۔کیسی نفرت؟ کیسا عناد اور کیسی ناراضگی؟

یوں لگ رہا تھا جیسے نفرت کا غبار کسی گہری بدلی کی مانند ذہن پر چھا کر پل بھر میں برس گیا ہو۔جذبات میں عجیب سی خواہشات انگڑائیاں لے رہی تھیں۔

رومی ثاقب سے باتوں میں محو ہوتی تو اس سے اس کا جی چاہتا کہ وہ رومی کو اُٹھا کر خود اس کی جگہ لے لے۔ثاقب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ایسی ہنسی جس میں ہر چیز بہہ جائے۔اور فضا ترنم ریز ہو جائے۔

لیکن ثاقب کا رویہ حوصلہ شکن تھا۔وہ طنز کے تیر برساتا۔گہری چوٹیں کرتا جن میں کٹاری کا سا انداز ہوتا۔وہ انداز جو اس کے قلب وجگر کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔عجیب سی بے بسی اس پر طاری ہو چکی تھی۔لیکن کمزوری کے اظہار کو وہ اپنی توہین سمجھتی تھی۔یہ اس کی ضدی فطرت کے خلاف تھا۔

اور نتیجتاً اس نے ان کی محفلوں میں شرکت سے گریز کرنا شروع کر دیا۔اس دن پائیں باغ میں بیڈمنٹن کا مقابلہ ہونے والا تھا سبھی اکٹھے ہو چکے تھے۔ارم ابھی تک نہ آئی تھی۔نجم کو اسے بلانے کے لیے بھیجا گیا۔اس نے واپس آ کر اطلاع دی کہ اس کے سر میں درد ہے۔وہ نہیں آئے گی۔

''بھلا ارم کے بغیر کیا لطف آئے گا'' ثاقب نے بے اختیار سوچا۔

اسے جلا کر،اس کا تمسخر اڑا کر اسے سکون محسوس ہوتا تھا۔گزشتہ چند دنوں سے اس

کا بدلا بدلا رویہ، خاموش انداز اس سے بہت کچھ کہہ گیا تھا۔ لیکن ابھی دل کے گہرے گھاؤ مندمل نہیں ہوئے تھے۔ ابھی خلوص کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان باقی تھے۔ ابھی انتقامی روح تسکین پذیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے اور مجروح کرنا چاہتا تھا۔ کچھ اور تڑپانا چاہتا تھا۔

''جاؤ رومی تم ارم کو لے کر آؤ۔''

رومی کے ساتھ احسن اور سہیل بھی چلے گئے۔

اس نے کھیل میں شرکت سے قطعی انکار کر دیا اور وہ لوگ ناکام واپس آ گئے۔

کھیل تو کھیلا گیا لیکن ثاقب کو ذرا لطف محسوس نہ ہوا۔

اس کے باوجود کہ ارم کی موجودگی اور اس کی باتیں ثاقب کے لطیف احساسات کو کچوکے لگاتیں۔ اس کے سکون کو لوٹ لیتیں۔ اور وہ اپنے سینے میں خلش سی محسوس کرنے لگتا۔ بایں ہمہ وہ اسے دیکھنے کا متمنی رہتا۔ اور اب تو صورت حال ویسے ہی بدلی ہوئی تھی۔

کھیل ختم ہونے کے بعد سب اسے دیکھنے کے لیے گئے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ چاکلیٹی پینٹ اور سفید آدھی آستینوں کی قمیض میں وہ حد درجہ وجیہہ اور حسین نظر آ رہا تھا۔ اس کی شوخ شوخ آنکھیں ہیرے کی طرح جگمگا رہی تھیں اور بکھرے ہوئے گھنے سیاہ چمکدار بال بہت ہی بھلے لگ رہے تھے۔

ارم پلنگ پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھی۔ سب کے آ جانے کی وجہ سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''کہیے! ۔۔۔ سر درد کا کیا حال ہے ارم باجی؟'' احسن نے اس سے پوچھا۔

''عقل مند ہیں، بہانے سے کام لے کر خود کو بچا گئیں ورنہ ہارنے کے بعد زیادہ درد محسوس ہوتا۔'' ثاقب نے تیز لہجے میں کہا۔

تڑپ کر اس نے ثاقب کو دیکھا جو پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے دریچے سے باہر دیکھ رہا تھا۔توہین کے اتنے گہرے احساس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ناقابل برداشت درد کی لہریں اُسے اپنے دماغ میں اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔کسی بپھری ہوئی موج کی طرح وہ اُٹھی اور سب کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی۔

''نکل جاؤ میرے کمرے سے تمہیں یہاں آنے کی اجازت کس نے دی ہے۔۔۔؟''

''آپ نے۔۔۔۔!''

ثاقب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اس کے لبوں پر بڑی شریر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ارم نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے اور ثاقب رومی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

ان کے جانے کے بعد نڈھال ہو کر اس نے سر تکیے پر رکھ دیا۔اس کا ذہن سن ہوتا جا رہا تھا۔مذاق اُڑاتی نگاہیں اس کی آنکھوں کی راہ سے قلب وجگر میں اترتی جا رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ثاقب نے ریکٹ بستر پر پھینک دیا۔اور پنکھا پوری قوت سے چلا دیا۔اسے اپنی زیادتی پر افسوس سا ہو رہا تھا۔چند لمحوں تک اس کا ذہن حالیہ واقعے کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اس نے سر جھٹک دیا۔

شام ہو گئی تھی وہ رفعت کے کمرے میں داخل ہوا۔کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔پلنگ پر رفعت نیم دراز تھیں اور ان کے سینے پر سر رکھے کوئی لیٹا ہوا تھا۔

''امی۔۔۔!'' اس نے پکارا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دیا۔کمرہ برقی روشنی سے جگمگ جگمگ کر اُٹھا اور اس جگمگاتی روشنی نے جو منظر اسے دکھایا اس پر اسے بے ساختہ پیار آ گیا۔ارم اس کی امی کے سینے پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔رفعت اسے

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

بازوؤں میں سمیٹے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''آؤ ثاقب۔۔!'' رفعت نے اُسے دروازے میں کھڑے دیکھا۔

اس نے پہلی بار ارم کو اپنی دھڑکنوں کے قریب تر محسوس کیا۔

وہ خلیجیں جنہیں پاٹنا اسے ممکن نظر نہ آتا تھا۔وہ فاصلے جنہیں طے کرنا اسے دشوار دکھائی دیتا تھا۔وہ دیواریں جنہیں گرانا اسے محال لگتا تھا۔اب ان کی حقیقت اس کے سامنے جھاگ سے زیادہ نہ رہی تھی۔

وہ یہ بھول گیا تھا کہ ان کے درمیان ایک ایسی ہستی موجود ہے جس سے ارم کو والہانہ پیار ہے۔اپنی ماں سے اس کا بے پناہ پیار ثاقب کے لیے شانتی کا باعث تھا۔

ماں اسے بھی تو محبوب تھی۔

''رفی آپا!۔۔'' باہر سے عصمہ نے انہیں پکارا۔

اور وہ ارم کا سر تکیے پر رکھ کر باہر جانے لگیں۔

''تم بیٹھو ثاقب! میں ابھی آئی۔'' وہ باہر جاتے ہوئے بولیں۔

''ارم۔۔۔'' ثاقب نے اس کے قریب پہنچ کر پکارا۔

زخمی نگاہوں سے ارم سے اسے دیکھا۔اور تلخی سے بولی۔

''کہنے کے لیے اگر کچھ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی کہہ ڈالیے۔حسرت باقی نہ رہے۔''

اس کی نگاہوں میں درد تھا۔ثاقب پگھل اُٹھا۔

دل چاہا جھک جائے۔اسے سب کچھ سنا ڈالے اسے یہ بتا دے کہ یہ تمہارا سنگدلانہ رویہ تھا جس نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ورنہ ارم! تمہارے نام سے میرے کان اس وقت آشنا ہوئے تھے جب میرا شعور ابھی پختگی کی حدوں سے بہت دور تھا۔

اس نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔خوب صورت گھنے لانبے بالوں کی چوٹی اس کے بازو پر پھیلی ہوئی تھی۔اس کا چہرہ تکیے میں چھپا ہوا تھا۔

ثاقب اسے پکارنے ہی لگا تھا مگر چونک اُٹھا۔۔ذہن چیخ رہا تھا۔۔

''اتنی جلدی۔یاد کرو تمہارے خلوص کا کس بے دردی سے مذاق اُڑایا گیا۔ تمہارے جذبات کو کیسے پاؤں تلے روندا گیا؟ تمہاری تمناؤں کا منہ کیسے چڑایا گیا؟ اتنی جلدی جھک رہے ہو۔ہوش میں آؤ۔بڑھتے قدموں کو واپس اپنی جگہ لے جاؤ۔یاد رکھو ثاقب!۔۔۔تمہیں جھکنا نہیں جھکانا ہے۔''

وہ خود رفتگی جس کا نشہ اس کے حواس پر چھایا جا رہا تھا۔ختم ہو گئی۔جذباتی لمحے بیت گئے۔

اور تیز تیز قدموں سے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

باب نمبر:۲۶

شمیمہ خانم چند دنوں سے بیمار تھیں عصمہ اور رفعت ان کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں ۔شوخ وشریر بچوں پر جو تھوڑی بہت نگرانی تھی وہ بھی ختم ہوگئی ۔ چنانچہ آج کل وہ بالکل بے لگام ہو رہے تھے ۔ کمروں سے قہقہے اُبلتے ،موسیقی کی تانیں اُڑتیں ۔ دلچسپ لطائف ایک دوسرے کوسنائے جاتے ۔لیکن ایک نمایاں بات جو ہر فرد نے محسوس کی وہ ارم کی ان محفلوں میں عدم شرکت تھی ۔ کسی نہ کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر فوراً چلی جاتی ۔کبھی کبھی کھینچا تانی کرنے پر بیٹھ جاتی تو ثاقب کا ناروا سلوک اسے اُٹھنے پر مجبور کر دیتا ۔ چپکے سے وہ کوئی ایسا شگوفہ چھوڑ دیتا جو اس کے دل میں تیر کی طرح لگتا اور رستا ہوا خون اور تیزی سے بہنے لگتا ۔

اس دن کھانے کی میز پر ارم اور رومی موجود تھے ۔ثاقب نے کھانا کھاتی ارم کو کنکھیوں سے دیکھا اور پھر رومی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ۔

''رومی ! آج شام چار بجے تیار رہنا میرے ایک دوست کی سالگرہ ہے ۔''

ایک پل کے لیے ارم نے نگاہیں اُٹھائیں، دیکھا اور پھر جھٹک کر بے نیازی سے کھانا کھانے میں مصروف ہوگئی۔

''ارم باجی! آپ بھی چلیے گا نا ؟۔۔۔'' رومی ارم سے مخاطب تھی۔

''میں کیا نا خواندہ مہمان بن کر جاؤں ۔۔۔'' لہجہ کٹیلا تھا۔

''مطمئن رہئے ۔میں آپ کو لے جانے کے لیے تیار بھی نہیں ۔''

رومی کے سامنے اتنی توہین ۔ یوں لگا جیسے کسی نے اسے اُٹھا کر بارود کے کسی بھڑکتے ذخیرے میں پھینک دیا ہو۔ایک جھٹکے سے وہ اٹھ گئی ۔اس کے جسم سے آگ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں قہر آلود نظروں سے ثاقب کو گھورتے ہوئے چلائی ۔

'' آپ بہت آگے بڑھتے جا رہے ہیں ۔خود کو سنبھالیے ورنہ۔۔۔''

ثاقب کا چہرہ حد درجہ شگفتہ تھا ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی اس کیفیت سے بہت محفوظ ہو رہا ہو۔مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں اس کی طرف ذرا سا سر خم کرتے ہوئے بولا۔

''رک کیوں گئی ہیں آپ؟۔۔ جملہ اُدھورا چھوڑ دیا ہے ۔کہیے نہ۔ورنہ آپ کو تختہ دار پر لٹا دیا جائے گا۔''

''ثاقب!۔۔۔'' اس کی آواز میں شکست تھی ۔

ثاقب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فرمایئے!۔۔۔''

لیکن وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی ۔

اسی لمحہ ثاقب کے چہرے کی شگفتگی معدوم ہوگئی ۔سختی اُبھر آئی ۔

''ثاقب بھائی جان!۔۔۔آپ ارم باجی کے ساتھ ایسی باتیں کیوں کرتے

ہیں؟'' رومی نے مچلتے ہوئے کہا۔

لیکن اس نے رومی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔کھانا ادھورا چھوڑ کر ہی میز سے اُٹھ گیا۔کمرے میں پہنچ کر چند لمحوں تک وہ خالی نظروں سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتا رہا۔ضمیر ملامت کر رہا تھا دل ایسے ناروا سلوک سے پریشان تھا۔متاسف تھا اور بار بار احساس دلا رہا تھا کہ اسے اپنے طرزِ سلوک پر نادم ہونا چاہیے۔

لیکن دماغ ۔۔۔ان جذبات و احساسات کی شدت ،ارم کے سابقہ برتاؤ کے حوالے سے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ارم کو جھکانے پر مصر تھا۔اور دماغ کے مدلل دلائل کے سامنے دل ہار گیا تھا۔

ارم جانے کے لیے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔اتنی تیز روشنی کے باوجود اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔پلنگ پر بے سدھ لیٹ گئی۔دل و دماغ ماؤف تھا۔کچھ ہوش نہ تھا۔جانے کتنی دیر لیٹی رہی۔دریچے کا پردہ سرکا ہوا تھا اور اس میں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔دھوپ کی تپش نے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔پردہ ٹھیک کرنے کے لیے اُٹھی تو سن ہو کر رہ گئی۔

بہترین لباس میں ملبوس رومی اور ثاقب شانہ بشانہ چل رہے تھے۔وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ پارٹی پر جا رہے ہیں۔اپنی بے بسی پر ،توہین پر دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔سوچتی غور کرتی تو کسی حد تک خود ہی قصوروار نظر آتی۔لیکن پھر بھی یہ احساس پیدا ہوتا کہ آخر اس کا جرم اتنا سنگین تو نہ تھا جس کی اتنی کڑی سزا دی جا رہی ہے۔

جلاپا جو کسی گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگ کر اسے شدید گھٹن کا احساس دلا رہا تھا۔اب یک دم آگ پکڑ چکا تھا۔اور ثاقب کے ساتھ ساتھ اس نے رومی سے بھی بات کرنا چھوڑ دی۔

انہی دنوں نعیم آ گئے اور سارے بچے ان کے ساتھ چلے گئے ۔دن گہری اداسی میں ڈوبے گزرتے رہے۔

کالج کے گیٹ سے باہر نکل کر ارم نے یونہی ایک اچٹتی سی نظر اپنے دائیں بائیں ڈالی۔ نگاہیں مایوس ہو کر لوٹیں کار کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ کتابیں سنبھالتے ہوئے ۔اُس نے خود سے کہا۔امی میری طرف سے کیسی لاپرواہ ہوتی جارہی ہیں۔

مجھے پک کرنا انہیں یاد ہی نہیں رہتا۔تبھی تیزی سے آتی ہوئی ایک کار اس کے قریب رک گئی۔رخ پھیر کر اس نے دیکھا،سورج کی حدت سے چہرہ تو پہلے ہی سرخ تھا اب ثاقب کی صورت دیکھ کر کچھ اور بھی سرخ ہو گیا۔دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔

''آؤ!۔۔۔'' ثاقب نے اندر بیٹھے بیٹھے دروازہ کھول دیا سڑک پر کھڑے کھڑے اس نے ایک نگاہ غلط انداز گاڑی اور ثاقب پر ڈالی اور سوچا کہ اندر بیٹھ کر جلی ہوئی طنزیہ باتیں سننے سے یہ بہتر ہو گا کہ وہ گرمی میں پیدل چلنے کی تکلیف گوارا کر لے۔قلبی تکلیف کے آگے جسمانی تکلیف کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔چنانچہ وہ شکریہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

اس کی اس ادا پر ثاقب بے اختیار مسکرا اُٹھا۔دروازہ کھول کر تیزی سے اس کے پاس پہنچتے ہوئے بولا۔

''یہ شارع عام ہے یہاں کھڑے ہو کر یوں ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔کار میری ذاتی ملکیت نہیں۔جو یوں تم بیٹھنے سے گریزاں ہو۔''

''یہ کار آپ کے تصرف میں رہتی ہے۔اس وقت اسے آپ ڈرائیو کر رہے ہیں اور آپ کے ساتھ بیٹھنا مجھے پسند نہیں۔'' اس کا لہجہ تیز اور غصیلا تھا۔

بے اختیار ثاقب کا جی چاہا کہ اسے تپتی اور سلگتی دوپہر میں یونہی چھوڑ کر چلا جائے۔ پیدل دو میل کی مسافت طے کر کے جب گھر پہنچے گی تو دماغ ٹھکانے آ جائے

گا۔لیکن اسی لمحے اس کے سامنے رفعت کا چہرہ آ گیا۔عصمہ کا چہرہ نظروں کے سامنے پھر گیا۔ماں منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی ہوگی۔اور جب خالی کار لے کر جائے گا تو کیا بہانہ کرے گا؟اپنی امی سے کہیں زیادہ اسے عصمہ کا خیال تھا۔اس لو برساتی دوپہر میں جب وہ چلتی ہوئی گھر پہنچے گی تو انہیں کتنی تکلیف ہوگی؟ کیا سوچیں گی وہ؟ آخر وہ ان کی بیٹی ہے۔

یہ سوچ کر اس نے چند قدم آگے بڑھائے اور اسے بازو سے پکڑ کر کار کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

''یہ ضد کسی اور وقت پر اُٹھا رکھو۔اتنی شدید گرمی میں یہ اکڑ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔''

''چھوڑ دیجیے میرا ہاتھ،ورنہ میں شور مچا دوں گی۔''

''کار میں سکون سے بیٹھ کر شور مچانا۔''

اسے کار کے اندر دھکیل کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔پھر کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''حیرانی کی بات ہے۔آپ اب تک خاموش بیٹھی ہیں۔میں تو واویلا سننے کا منتظر ہوں۔چیخیں۔۔چلائیں۔۔تا کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بدمعاش کسی لڑکی کو بھگائے لیے جا رہا ہے۔''

وہ غصے سے منہ پھلائے بیٹھی رہی۔چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔کار پورچ میں رکی اور وہ تیر کی طرح نکل کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

باب نمبر: ۲۷

کتاب پر جھکا سر تیزی سے اوپر اُٹھا۔ شبنمی آنکھوں پر دراز گھنی پلکوں میں تیز جنبش ہوئی۔

کرسی کے دائیں بازو کی طرف قدرے جھکتے ہوئے اس نے کان ملحقہ کمرے سے پیدا ہونے والی آواز پر لگا دیئے اور یہ سمجھنے میں اسے قطعی وقت نہ ہوئی کہ گفتگو کن کے درمیان ہو رہی ہے۔

''اورنگزیب! بیٹے کے پاک فضائیہ کا ایک جوانباز پائیلٹ بنانے کی تمنا کا اظہار ہمایوں نے اس وقت کیا تھا جب نہ بیٹے کا کوئی وجود تھا اور نہ ہی پاک فضائیہ کا۔ آج جب کہ بیٹا اور پاک فضائیہ دونوں تخلیق پا چکے ہیں تو ہمایوں کی خواہش کی تکمیل میری زندگی کا اولین فرض بن جاتا ہے۔ مجھے تلخ حالات نے سکھا دیا ہے کہ اگر تقدیر غموں اور دکھوں کی ضربیں لگانے پر اُتر آتی ہے تو ہمارے ڈر، وسوسے اور خوف اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ ہمایوں کی ہوا بازی سے میں خائف تھی۔ لیکن میرا خوف اس کی زندگی کے ٹوٹے

ہوئے رشتے کو نہ جوڑ سکا۔اس خدائے عظیم پر کامل اعتماد ہمیں زندگی اور موت کے خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں رفی آپا۔۔مجھے تو صرف آپ کا خیال تھا۔''

''اورنگزیب!۔۔۔میری زندگی اسی خواہش کے گرد گھومتی رہی ہے اور اب تو اس کی تکمیل کا وقت آ گیا۔خدا کرے وہ منتخب ہو جائے۔''

''ثاقب جیسے بیٹے پر فخر کیا جا سکتا ہے۔رفی آپا! وہ انشا اللہ ضرور منتخب ہو گا۔ میں نے یہ خوش خبری ابھی آپ کو سنائی تھی کہ اس نے بی۔ایس۔سی میں یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے۔''

''خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' تشکر کے جذبات سے مغلوب آواز رفعت کے ہونٹوں سے نکلی۔

''نتیجہ تو ابھی نہیں نکلا۔۔۔'' انہوں نے پوچھا۔

''بس ایک ہفتے تک نکل آئے گا۔۔کل پرسوں تک اخباری نمائندے اس کی تصویر اور انٹرویو لینے آئیں گے۔''

اس کی غیر معمولی ذہانت اور ان تھک محنت کے پیش نظر اس کا یونیورسٹی میں ٹاپ کرنا کوئی انوکھی بات نہ تھی۔وہ واقعی اس اعزاز کا مستحق تھا۔

نشست درست کرتے ہوئے ارم خود بخو دبڑبڑائی۔

''اخباروں میں تصویریں چھپیں گی۔۔۔انٹرویو لیے جائیں گے۔۔۔اس کے عزائم کو رپورٹر بڑھا چڑھا کر قلم بند کریں گے۔گھر والوں کے چونچلے کچھ اور بڑھ جائیں گیا۔اور دماغ جو پہلے ہی بد دماغی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے اس میں اور بھی رعونت آ جائے گی۔''

نگاہیں سامنے مرکوز تھیں تصور کا آنچل خیالی ہوا کے تیز تھپیڑوں سے پھیل رہا تھا اوراس پھیلتے لہراتے آنچل پر ثاقب پائیلٹ کی وردی میں ملبوس دکھائی دے رہا تھا۔لانبا قد، صحت مند جسم اور پر کشش شکل اس لباس میں حد درجہ دل آویز نظر آرہی تھی ۔۔۔آج سے دو سال قبل کا دیکھا ہوا ایک پائلٹ فلائنگ سوٹ میں ملبوس اس کے تصور میں اُبھرا۔اسے پائیلٹ بچپن سے ہی پسند تھے فضاؤں میں دندناتے تری اور نڈر ہوا بازوں سے جو زندگی کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں،وہ گہری وابستگی رکھتی تھی۔

اسے اپنے بڑے ابو ہمایوں سے اسی بنا پر گہری عقیدت تھی کہ وہ ایک بہترین ہوا باز تھے۔

''ارم! کھانا نہیں کھاؤ گی۔ عصمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

چونک کر اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ایک بج رہا تھا۔کتابیں سمیٹ کر میز پر ترتیب سے رکھتے ہوئے وہ بولی۔

'' آپ چلیے میں آرہی ہوں۔''

کھانے کی میز پر گھر کے سبھی افراد موجود تھے اس نے ثاقب کو دیکھا۔اس کی پر کشش آنکھیں خوشی کے بے پایاں احساس سے چمک رہی تھیں۔ثاقب کی تعریف میں قصیدے پڑھے جارہے تھے۔اس کے مستقبل کے متعلق ہر فرد جوش وخروش سے اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔نجم اور سہیل خوشی سے پھولے نہ سمارہے تھے اوراس کے ابو، امی تو خوشی سے بے قابو ہوئے جاتے تھے۔

''خدا کرے اگلے سال میری ارم رانی بھی ایسے ہی نمبر حاصل کرے۔'' رفعت نے پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسی حسین امیدیں آپ ارم کی ذات سے وابستہ مت کیجیے رفی آپا! اسے تو

عمدہ کھانوں اور بہترین لباس سے سروکار ہے۔اس کے ناز نخرے پورے ہوں یہی کافی ہے پڑھنا اور اچھے نمبر لینا اس کے بس کا روگ نہیں۔''

کھا جانے والی نظروں سے اس نے ماں کو گھورا لیکن وہ اطمینان سے کھانا کھانے میں مصروف تھیں۔

''نہیں بھئی یوں مت کہو۔میری بٹیا رانی اس بار خوب محنت کرے گی۔'' رفعت نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

اس کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی۔دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔رومی کی آمد نے جو حسد کے جذبات اس میں اُبھار دیئے تھے وہ اگر چہ رفتہ رفتہ ختم ہو گئے تھے۔مگر اب وہ ایک بار پھر ثاقب سے بے پناہ حسد محسوس کر رہی تھی۔اس ساری توہین،اس بے عزتی کا ذمہ دار وہ صرف ثاقب کی ذات کو ٹھہرا رہی تھی۔نہ وہ آتا اور نہ اس کی علمیت کا رعب جمتا اور نہ اسے طعن وتشنیع کے تیروں سے یوں چھلنی کیا جاتا۔

وہ نڈھال سی ہوگئی۔۔

شدت سے اس کا دل چاہا کہ ثاقب اس گھر سے چلا جائے۔اس کی نظروں سے دور ہو جائے۔تا کہ یہ دماغی اُلجھاؤ۔۔یہ ذہنی انتشار۔۔تو کسی طرح ختم ہو۔

یہ شاید اس کی دعاؤں کا اثر تھا کہ چند روز بعد ہی اخبار میں پاکستان ایئر فورس کی جی۔ڈی پائلٹ برانچ کے لیے امیدوار مانگے گئے۔

ثاقب جانے کے لیے پہلے ہی پر تول رہا تھا۔فوراً درخواست دی۔اور ایک دن اسے پی۔اے۔ایف ریکروٹنگ آفس میں ابتدائی انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔

اس کا بلند و بالا قد۔۔صحت مند جسم۔آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت کی چمک چہرے پہ اعتماد کی گہری چھاپ اور غیر معمولی قابلیت۔سبھی چیزیں متاثر کرنے والی تھیں۔

ابتدائی طبی معائنہ ہوا۔تحریری ٹیسٹ لیا گیا، سبھی میں وہ نمایاں تھا۔ذہانت کے ٹیسٹ کے لیے اسے کوہاٹ بھیجا گیا اور میڈیکل ٹیسٹ کے لیے کراچی، دونوں جگہ اس کا نام سرِفہرست تھا۔

آج کل وہ گھر پر تھا۔

اور ائرفورس ہیڈکوارٹر سے بلاوے کا منتظر۔۔۔

باب نمبر:۲۸

ائر ہیڈ کوارٹر سے آیا ہوا خط اس کے سامنے میز پر پڑا تھا۔دھیمی دھیمی مسکراہٹ نے سارے چہرے کو منور کر رکھا تھا۔وہ خواب جو اس نے دیکھے تھے۔۔۔وہ سپنے جن میں وہ کئی بار کھویا تھا تکمیل کا جامہ زیب تن کرنے کے لئے تیار تھے ایک ہفتے کے بعد اسے فضائی تربیت کے لیے رسالپور ٹریننگ کالج پہنچ جانا تھا۔خط کے ٹائپ شدہ حروف میں مستقبل کسی حسین نازنین کی جبیں پر جھلملاتے جھومر کی طرح جگمگاتا نظر آ رہا تھا۔فضاؤں سے والہانہ پیار اسے وراثت میں ملا تھا۔خطرات سے اسے محبت تھی۔وہ زندگی کو ایک انوکھے رنگ بخشنے کا متمنی تھا۔ایک ایسا رنگ جس کے حسن میں اس کی ساری شخصیت ڈوب جائے اور وہ امر ہو جائے۔

بچپن میں طارق، خالد بن ولید، اور محمد بن قاسم جیسے مایہ ناز سپوتوں کی کہانیاں اس کے کانوں میں شہد گھول جایا کرتی تھیں۔جن کی لذت اسے آج تک محسوس ہوتی تھی ان کہانیوں نے اس کے ناپختہ ذہن کی تعمیر میں ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا۔اسے عام لوگوں کی

طرح زندگی گزارنے سے نفرت تھی۔وہ تو زیست کے ان چند لمحوں میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دینا چاہتا تھا جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں۔

اس نے خط پر دوبارہ نظریں دوڑائیں۔۔۔کچھ سوچتا رہا اور پھر خود سے بولا۔ ہفتہ کی شام کو روانگی ٹھیک رہے گی۔اس روانگی نے کتنے ہی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے لا کھڑے کیے۔اس کے دل میں ہلکی سی درد کی ٹیس اُٹھی۔اٹھارہ سالہ زندگی میں وہ پہلی مرتبہ اپنی ماں سے جدا ہوگا۔اس تصور سے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔

ہوا کے تیز جھونکے کی مانند ایک شوخ وشنگ سراپا اس کے خیالوں کی دنیا میں اپنی تمام تر دلفریبیوں اور رعنائیوں سمیت اُبھر آیا۔وہ چہرہ جس پر پھیلتے اور سکڑتے بیزاری کے سائے اس کی تمناؤں کے ننھے منے شگوفوں کے منہ مسل ڈالتے۔تلخ اور زہریلا لہجہ دل میں بجتی شہنائی کا گلا گھونٹ دیتا۔جس کی نفرت کے متعلق سوچتے ہوئے، اس کی آنکھوں کی جوت مدھم پڑنے لگتی۔

''اسے میرے جانے سے یقیناً خوشی ہوگی۔۔۔۔''

''کاش ارم! تم جان سکو کہ میں چاہنے کے باوجود تم سے نفرت نہ کرسکا۔''

شام ہورہی تھی۔وہ اُٹھا اور رفعت کے کمرے کی طرف چل دیا۔وہ اپنے کمرے میں موجود نہ تھیں۔ادھر ادھر دیکھا لیکن کہیں نظر نہ آئیں۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ یقیناً ارم کے کمرے میں ہوں گی۔واپس آیا تاکہ کسی نوکر کو انہیں بلانے کے لیے کہے۔عین اسی وقت اسے یاد آیا کہ ارم اپنی کسی دوست کے ہاں گئی ہوئی ہے۔دوپہر کے کھانے پر وہ عصمہ سے جانے کے لیے پوچھ رہی تھی۔کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے بھاری پردے کو ہٹا کر اندر جھانکا۔

رفعت پلنگ پر لیٹی تھیں۔آگے بڑھا اور ان کے قریب پہنچ کر انہیں پکارا۔

لیکن وہ سو رہی تھیں ۔جگانا مناسب خیال نہ کرتے ہوئے چلے جانا چاہا۔

کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں ۔اس کی تیز نگاہوں نے رائیٹنگ ٹیبل پر پڑے البم کو ایک نظر میں ہی تاک لیا۔تیزی سے وہ اس کی طرف بڑھا۔ورق الٹائے ۔۔ارم کی بے شمار خوبصورت تصویریں دل میں ہلچل پیدا کر گئیں۔اس کی اشتیاق بھری نظروں نے تین چار تصویروں کو خصوصیت سے سراہا۔دل کے کسی گوشے سے صدا آئی ۔

''اُڑا لو۔''

مدھر مدھر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ تیزی سے ان تصویروں کو البم میں سے نکال رہے تھے۔

تصویروں کو جیب میں رکھتے ہوئے اس نے میز پر رکھی کتابوں اور کاپیوں کا سرسری جائزہ لینا شروع کیا۔پریکٹیکل کی کاپیاں اپنی زبوں حالی کا رونا رو رہی تھیں۔کام حد درجہ لاابالی انداز میں کیا گیا تھا۔

کتابوں کے صفحوں اور کاپیوں کے اندرونی اوراق پر اس کی مصوری کے نمونے اپنے جلوے دکھا رہے تھے۔عصمہ کے الفاظ کانوں میں گونجے اور بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''تھرڈ ڈویژن میں بھی پاس ہو جائے تو غنیمت ہے۔'' واقعی قرائن تو یہی بتا رہے ہیں۔

دراز کے تالے میں پھنسا ہوا چابیوں کا گچھا جھول رہا تھا۔جلدی میں شائد وہ اسے نکالنا بھول گئی تھی اس نے دروازہ کھولا۔سنہری مجلد ڈائری پر اس کی نظریں جم گئیں۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اسے اُٹھالیا۔۔یہ ارم کی ڈائری تھی۔

''ڈائری''

جس میں سر بستہ راز پوشیدہ ہوتے ہیں ۔ وہ راز جو لکھنے والے کی شخصیت اور کردار کو بے نقاب کر دیتے ہیں ۔ ثاقب کے بیدار ضمیر نے اسے ملامت کی ۔

''یوں چوری چھپے کسی کی تحریر پڑھنا جرم ہے، ثاقب!'' اس خیال کے تحت اس نے ڈائری رکھ دی۔لیکن دماغ میں کشمکش جاری تھی ۔دماغ اسے اُٹھانے کے مشورے دے رہا تھا۔تذبذب کی سی کیفیت اس پر طاری تھی ۔لیکن انسان کے جذبہ تجسس کو کیا کہا جائے ۔ جو ہمیشہ راز پر سے پردہ اُٹھانے ۔۔اور اسرار کو جاننے کا متمنی رہتا ہے ۔

ارم بھی تو ایک راز تھی ۔ایک معمہ تھی ۔اس راز کی گہرائیوں میں ثاقب اتر جانا چاہتا تھا۔اس معمے کو وہ حل کرنا چاہتا تھا۔ان اسباب کا جائزہ لینا چاہتا تھا جو اس کی نفرت کا باعث تھے ۔اس نے متجسس نظروں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

رفعت سو رہی تھیں ۔

ڈائری بغل میں دبائی اور باہر نکل آیا۔کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کیا اور ڈائری کے مطالعہ میں محو ہو گیا۔ڈیڑھ گھنٹے بعد جب اس نے آخری صفحہ ختم کیا تو اس کے ہونٹ متبسم تھے ۔آنکھوں میں خوشی کا بے پایاں احساس رقصاں تھا۔وہ خوش تھا کہ ڈائری نے ارم کی شخصیت کو بے نقاب ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان سب باتوں پر سے بھی پردہ اُٹھایا تھا جو اس کے اُلجھے اُلجھے رویے کا باعث تھے ۔معمہ حل ہو چکا تھا۔

وہ باہر نکلا ۔گھر کا ایک چکر لگایا ۔ارم ابھی تک واپس نہیں آئی تھی ۔ڈائری اُٹھائی اور ارم کے کمرے میں اسی جگہ رکھ دی، جہاں سے اٹھائی تھی ۔

رفعت ابھی تک سو رہی تھیں ۔

اس کی ذہنی پریشانی رفع ہو چکی تھی ۔مسرت کا احساس رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔

یہ احساس سکون بخش رہا تھا کہ اس کی ماں اور اس کی تمناؤں کا مرکز ان کی دسترس سے دور نہیں۔

پانچ چھ دن جلدی سے گزر گئے۔ شمیمہ خانم اور ان کے سب بچے آئے ہوئے تھے۔ کیونکہ اگلی شام کو ثاقب کی روانگی تھی۔ اس دوران میں ثاقب نے ارم سے کوئی بات نہیں کی اور نہ اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کی تحریر پڑھ چکا ہے۔

ہال میں قہقہوں اور مسرتوں کا طوفان امنڈا ہوا تھا۔ احساس مسرت سے گلنار چہروں پر زندگی کی حرارت سے بھرپور مسکراہٹیں رقصاں تھیں۔ بات بات پر مسکراہٹ قہقہوں میں بدل جاتی۔ اور کمرے کی دیواریں گونج اُٹھتیں۔

اسی وقت مجمع میں سے کسی نے ثاقب سے گانا سنانے کی فرمائش کی۔

''واقعی ثاقب بھائی اس حسین اور یادگار رات کے حسن میں اضافہ کرنے کے لیے اپنی آواز کا جادو جگائیے۔'' رومی نے التجا کی۔

رومی کے خاموش ہوتے ہی سبھی چلائے۔

''ایک عدد گانا۔۔۔پلیز!''

''پہلے پارسل گیم کھیلی جائے اس کے بعد میں گانا سناؤں گا۔'' ثاقب نے شرط عائد کی۔

''پہلے گانا!۔۔۔'' سب کا اصرار تھا۔ اور اس متفقہ اصرار پر اسے جھکنا ہی پڑا۔

ہال کے کونے میں موجود پیانو کے سامنے وہ بیٹھ گیا۔ مشتاق انگلیاں تیزی سے کیز پر تھرکنے لگیں۔ نظریں اوپر اُٹھیں، اور پل بھر میں سب فاصلے طے کرتی ارم پر مرکوز ہو گئیں۔

''ارم!۔۔۔'' اس کی روح نے سرگوشی کی۔ دل نے پیار بھرے لہجے میں اسے

آواز دی۔ میں تمھیں ایک ایسا گیت سناؤں گا ارم! ایسا گیت جس کی المیہ تانوں میں تمہارا دل ڈوب ڈوب کر ابھرے گا۔ گیت کے بول ہواؤں کے دوش پر لہراتے تمہارے کانوں میں چپکے سے میرے دل کی بات کہہ دیں گے۔ وہ بات جو میرے جذبات واحساسات کی مکمل ترجمانی کرے گی۔ موسیقی کا سحر تمہاری خود ساختہ نفرت کے جال توڑ دے گا۔ تب تمہارے حسین نین پیار کی جوت سے جل اُٹھیں گے۔ یاقوتی لبوں پر دل نواز مسکراہٹ ابھرے گی۔ وہ مسکراہٹ جو میری زندگی ہوگی۔

وہ ترنم سے ساحر کی نظم سنا رہا تھا۔

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی اِن نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں
میری اُجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی کبھی غیر نظر آتی ہے
کبھی اخلاص کی صورت کبھی ہرجائی ہے
پیار پر بس تو نہیں ہے میرا لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنہیں
ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

ثاقب کی پرسوز آواز سے ان کے دل دھڑکنا بھول گئے تھے سحر زدہ انسانوں کی

طرح وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ اور ارم تو ڈوبتی جا رہی تھی۔ خود پر قابو نہ تھا۔

گیت ختم ہو گیا۔ لیکن وہ سب کے سب ابھی تک ویسے ہی مسحور سے بیٹھے تھے۔ یوں جیسے جادو کر دیا گیا ہو۔

''خدا کی قسم ثاقب بھائی جان! اگر میں کسی ریاست کا نواب ہوتا تو بخدا آدھی ریاست آپ کو بخش دیتا۔'' سلیم نے ہاتھ لہراتے ہوئے سکوت توڑا۔ خوابیدہ قہقہے جاگ اُٹھے۔

ثاقب!۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے دروازے کے قریب آ کر اُسے پکارا۔

''درزی کپڑے دے گیا ہے انہیں دیکھ لو۔''

''جی اچھا!۔ کہتے ہوئے ثاقب باہر چلا گیا تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو سیفی باہر سے آ کر اس کی جگہ پر قابض ہو گیا تھا۔ ارم کے قریب جگہ خالی تھی۔ ثاقب اسی طرف بڑھ گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کے رخساروں پر پھوٹتی شفق محسوس کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر دزدیدہ تبسم بکھر گیا۔

پارسل گیم شروع ہوئی۔

موسیقی رکی اور پارسل سیفی کے ہاتھوں میں آ گیا۔ پڑھا گیا۔

''دلہن کا پوز بنایئے۔''

قہقہوں کا ایک طوفان تھا جو بہہ نکلا۔

''بنو دلہن سیفی۔'' آوازیں آ رہی تھیں۔

''گھبراتے کیوں ہو؟'' سیفی نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور پاس بیٹھی رومی کے گلے سے جھپٹ کر دوپٹہ اُتار لیا۔ ایسا حسین پوز بنایا کہ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

اب ارم کی باری تھی۔

''ڈانس کیجیے۔''

دو تین بار اس نے عذر کیا لیکن بالآخر سب کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔اتنا خوبصورت اور سحر انگیز رقص۔۔۔ثاقب تو جانتا ہی نہ تھا کہ وہ اس میدان کی بھی مشتاق کھلاڑی ہے۔کھیل جاری تھا۔وہ لوگ کھیل سے حد درجہ محظوظ ہو رہے تھے تبھی موسیقی رکی اور پارسل ثاقب کے ہاتھوں میں تھا،متجسس نگاہیں ثاقب کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

سیفی نے کھڑے ہو کر پڑھا۔

''آپ کے بائیں ہاتھ جو کوئی بھی بیٹھا ہوا ہے اسے انگوٹھی پہنایئے۔''

اور بائیں طرف ارم تھی۔

خوب خوب تالیاں پیٹی گئیں۔ہنستے مسکراتے چہروں نے ایک طوفان اُٹھا دیا۔

شرم وحیا کی لہریں ارم کے چہرے پر رقصاں تھیں اور ثاقب خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''بھئی انگوٹھی کہاں سے لاؤں۔۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہم نہیں جانتے کہیں سے بھی لایئے۔'' سبھی چلائے۔

کمال ہے کہاں سے لاؤں؟بازار کوئی قریب ہے۔دوکانیں کیا کھلی ہیں؟میرے ہاتھ اور پاؤں کوئی جناتی ہیں کہ بند تالوں سے چیزیں اڑا کر لے آئیں۔

دفعتاً رومی باہر بھاگی اور چند لمحوں بعد ہاتھوں میں کچھ لیئے ہوئے آئی۔

''لیجئے پہنایئے ارم باجی کو۔''

ارم کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔ ثاقب کی نگاہوں کا والہانہ پن،ان میں جھلکتا ہوا پیار کا گہرا احساس اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ پیدا کر چکا تھا۔رخساروں سے شہابی رنگ

چھونا پڑ رہا تھا۔

دھیرے سے ثاقب نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔اس کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی تو اسے ایک خواب کا سا گماں گزرا۔

بے خودی کھوئی کھوئی وہ دیکھ رہی تھی کہ ثاقب اس کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا رہا ہے۔بے پناہ شور تھا۔ثاقب نے یہ کہتے ہوئے ان کی توجہ منعطف کرائی کہ۔۔

''گواہ رہیے۔میں نے ارم کو انگوٹھی پہنا دی ہے۔''

''انگوٹھی پیتل کی تو نہیں ثاقب بھائی جان؟۔۔'' نجم بولا۔

''یہ رومی جانے اِس کارنیک کیلئے بھاگ دُور کرنے والی۔''

اس کا ہاتھ ابھی تک ثاقب کے ہاتھوں میں تھا۔دو تین بار زور سے اس نے اس کا ہاتھ دبایا اور پھر چھوڑ دیا۔

گیارہ بجے وہ اپنے کمرے میں آئی۔اس کا دماغ ماؤف تھا۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خوابوں کی سرزمین سے پھسلتی پھسلاتی یہاں پہنچ گئی ہو۔حقیقت اتنی دلفریب اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے،اس نے اپنے دل میں جھانکا۔اور اس نفرت کے بارے میں سوچا جو اسے ثاقب سے تھی۔ان کی آنکھوں میں چمکتی پیار بھری روشنی نفرت کی سیاہی پر غالب آ رہی تھی۔ اپنے ہاتھ پر ثاقب کے ہاتھ کا لمس اسے ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔ہلکا ہلکا دباؤ اس کے جذبات میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔سرور آگیں احساس بخش رہا تھا۔گواہ رہیے میں نے ارم کو انگوٹھی پہنا دی ہے۔

اس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئے تھے جنہوں نے سازِ دل کے خوابیدہ تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔اس کے جلتے ہوئے احساسات پر گویا شبنم پڑ گئی تھی۔

باب نمبر:۲۹

ثاقب جا چکا تھا۔ بہار اپنی تمام تر دلفریبیوں کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی۔ خزاں دبے پاؤں چلی آئی تھی۔ فضاؤں میں کھنکتے خوشگوار قہقہوں کو نیند آ گئی تھی۔

کھوئی کھوئی نظروں سے ارم نے اپنے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ گھمبیر سکوت، ہولناک سناٹا، پھیکی پھیکی دھوپ، زرد زرد اُڑتے ہوئے پتے۔ خاموش اور اداس چہرے۔

''یہ کیسا درد ہے جو میری روح میں سمایا جا رہا ہے؟ یہ کیسا طوفان ہے جو میرے پاؤں اکھیڑ کر اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے؟ ان آنکھوں کی عجیب و غریب چمک کو کیا نام دوں۔ وہ فسوں خیز چمک جس نے پل بھر میں میری سوچوں کے زاویے بدل ڈالے ہیں۔ اف! یہ کیا ہو گیا ہے؟ ثاقب کہیں تم میرے ساتھ کوئی سنگین مذاق تو نہیں کر گئے ہو۔''

''نہیں۔'' اس کے دل نے آواز دی اور روح نے آگے بڑھ کر ان خدشات کو سلا دیا۔

''میں نے سوچا تھا کہ تمہارا یہاں سے چلے جانا میرے لیے وجہ سکون ہو گا۔ لیکن

ان محسوسات کو کیا نام دوں؟ اس تڑپ کو کیا کہوں؟''

نگاہیں ہاتھ پر جم گئیں۔ وہ ہاتھ جس پر ثاقب کے ہاتھ کے دباؤ کا احساس اس کے خون میں ارتعاش پیدا کر دیتا تھا۔

''میں نے کتنی کم ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ثاقب تم نے تو چلے ہی جانا تھا۔ میں نے یہ کیوں نہ سوچا۔''

گہری اداسی میں ڈوبی وہ خود سے الجھتی رہی۔ پریشان ہوتی رہی۔ رفعت کمرے میں آئیں اور اسے چائے کے لیے لان میں لے گئیں۔

دن اڑتے جا رہے تھے۔ سرما بیت گیا اور اب بہار قوس قزح کے سے حسین رنگ لئے آکاش سے دھرتی پر اُتر رہی تھی۔ ثاقب کو رسالپور گئے سال ہو گیا تھا درمیان میں ایک بار وہ صرف ایک دن کیلئے آیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے خط لکھتا اور اپنے خط میں ارم کے متعلق مختصر الفاظ میں کچھ نہ کچھ لکھنا نہ بھولتا۔ اس کے ہر خط کو ارم پڑھتی۔ دماغ میں پیدا شدہ کشمکش کی لہریں جو کبھی کبھی اس کی بے سکونی کا باعث بنتی تھیں۔ اب پرسکون ہو کر خوشگوار کیفیتوں کو جنم دے رہی تھیں۔

شام ہو رہی تھی وہ برآمدے میں بیٹھی نوٹس لکھنے میں مصروف تھی۔ ہارن کی آواز پر نگاہیں اُٹھا کر دیکھا تو دوسرے گیٹ سے ایک ٹیکسی پورچ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''جانے کون آیا ہے؟'' سوچتے ہوئے وہ دوبارہ اپنے کام میں محو ہو گئی۔

تیز تیز چاپ پر اس نے سوالیہ انداز میں نگاہیں اُٹھائیں۔ نگاہیں جو اٹھیں تو اٹھی ہی رہ گئیں۔

وردی میں ملبوس فلیٹ کیپ پیشانی تک جھکائے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس پکڑے ایک پاؤں برآمدے کی سیڑھی پر اور دوسرا نیچے رکھے ثاقب ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ

لیے دلنشین انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔

لطیف لطیف دھڑکنوں کے مدوجزر کی دنیا میں اٹھے حجاب نے آگے بڑھ کر گھنی خوبصورت پلکیں آنکھوں پر گرادیں ۔سر جھک گیا، عارض دہک اٹھے ۔

''ارم تم ٹھیک ہونا ؟۔۔'' ثاقب کے لہجے سے محبت ٹپک رہی تھی ۔

ارم کی سیاہ آنکھیں پل بھر کے لیے حیرت ومسرت کے جذبات ۔لیے اوپر اٹھیں، کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکیں ۔

اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے کیف آور، شرمگیں احساس کی سرخی ثاقب کی آنکھوں اور ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ کو گہری کر رہی تھی ۔

''صاحبزادے صاحب! آپ کب تشریف لائے ہیں؟'' آسیہ خانم نے قریب آکر اسے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی ابھی ۔سب لوگ کہاں ہیں؟''

''بڑی اور چھوٹی بیگم صاحبہ بیگم زلفی کی عیادت کے لیے گئی ہیں ۔نجم اور سہیل باغ میں کھیل رہے ہیں ۔ڈاکٹر صاحب ہسپتال گئے ہیں ۔''

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ارم کی جھکی جھکی نگاہیں تیزی سے اوپر اٹھیں اور اس وقت تک اس سراپے کے تعاقب میں دوڑتی رہیں جب تک وہ کونہ کاٹ کر نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا ۔

مسرت کا ہلکا ہلکا احساس اس کی آنکھوں میں رچ گیا تھا ۔نیم باز آنکھوں سے اس نے اپنے سامنے دیکھا ۔ٹھیک اسی جگہ جہاں وہ شاہانہ انداز میں کھڑا تھا ۔مسکراتی آنکھوں سے نکلتی ضیاء پاش کرنیں اس کے قلب وروح میں کیف آور سرور پیدا کر رہی تھیں ۔

''بے وردی! ۔۔'' اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں ۔اس کی

وجیہہ اور جاذب نظر شخصیت کے لیے سونے پر سہاگے کا کام دے رہی ہے۔

کافی دیر بعد جذباتی دنیا سے نکلی۔اور کتابیں سمیٹ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

سہیل سے اسے معلوم ہوا کہ اس کی غیر معمولی قابلیت کے پیش نظر پاکستان ایئر فورس اسے ٹریننگ کے لیے امریکہ بھیج رہی ہے۔اور وہ گھر والوں سے ملنے کے لیے آیا ہے ایک ہفتہ بعد اسے امریکہ پرواز کر جانا ہے۔

رات کے کھانے پر گھر کے سبھی افراد موجود تھے۔سب خوش بھی تھے اور اس کے اتنے دور چلے جانے کے احساس سے قدرے غمگین بھی۔وہ انہیں کالج کی باتیں سنا رہا تھا۔ خود بھی ہنس رہا تھا اور انہیں بھی ہنسا رہا تھا۔

دن تیزی سے گزرتے گئے اور اب اس کی روانگی میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ دو دن جو دو لمحے تھے۔پلک جھپکتے میں بیت جانے والے۔

وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔قدم آگے بڑھانا چاہتی تھی۔اس جگہ کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کی متمنی تھی۔۔نفرت کی خلیجیں وہ پاٹ چکی تھی۔دل کی ساری کدورت ختم ہوگئی تھی۔

لیکن۔۔۔بڑھتی تو کیسے؟

اور یہی چیز اس کے اضطراب کا باعث بنی ہوئی تھی۔ثاقب نے اس دوران میں اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔البتہ کبھی کبھی اس کا شوخ شوخ انداز میں اسے دیکھنا ارم کے جذبات میں ہلچل مچا دینے کے لیے کافی تھا۔وہ اس کی خاموشی پر جھنجھلا رہی تھی۔ بل کھا رہی تھی۔پل بھر میں اس کے دماغ میں طوفان آ جاتا اور وہ خود سے کہتی۔

''ہوش میں آؤ ارم!۔۔ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟اگر اسے تمہارا احساس نہیں تو تم اتنی بے قرار کیوں ہو۔۔''

لیکن اگلے ہی لمحے اس کا اپنائیت سے بھرپور انداز نظر اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس دلا جاتا۔

وہ بے چین ہو اٹھتی۔

آخر اس کی راہ میں کون سے پہاڑ حائل ہیں؟ کون سے دریا ہیں جنہیں عبور کرنا اتنا محال ہو رہا ہے؟ وہ بات چیت کا سلسلہ کیوں نہیں شروع کرتا؟

دل و دماغ کی یلغار سے وہ گھبرا اٹھتی۔

وہ سوچوں کے ایک ایسے جال میں پھنس گئی تھی جس سے باہر نکلنے کا اسے کوئی راستہ نظر نہ آ رہا تھا۔ جال کی ان مضبوط ڈوریوں کو وہ مختلف انداز میں کاٹنے کی کوشش کرتی۔ لیکن بے سود۔۔۔

اور پھر اسی شام کو جب باہر شام کے ملگجے اندھیرے سرعت سے کائنات پر پھیلی روشنی کو تاریکی میں بدل رہے تھے۔ اس کے ذہن میں جہاں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ روشنی ہی روشنی بکھر گئی۔

ثاقب اپنے کمرے میں نیم دراز کسی کتاب کے مطالعہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ حالات سے وہ مطمئن تھا۔ کوئی خلش تھی نہ بے چینی۔ پرسکون سا وہ ارم کی بدلتی ہوئی کیفیات کا عمیق نظروں سے جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

وہ جھکنے کے لیے تیار نہ تھا۔

خادمہ نے اسے ایک لفافہ تھما دیا۔ پڑھتے پڑھتے وہ چونک اٹھا۔ قدرے حیرانی سے اس نے پہلے لفافے کو اور پھر خادمہ کو دیکھا۔

''ارم بٹیا نے دیا ہے۔'' خادمہ نے اس کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیا۔

دبی دبی مسکراہٹ بے اختیار اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ خادمہ کے جانے کے بعد

اس نے پراشتیاق ہاتھوں سے کھولا۔

بہ سفر رفتنت مبار کباد

بہ سلامت روی وباز آئی

ارم

قوس قزح جیسے کتنے ہی حسین رنگ پل بھر میں اس کے گرد بکھر گئے ۔ گنگنا تا ہوا پیغام سریلی موسیقی کے ساز پر مچلتا ہو دل کی دنیا میں اتر گیا اور حسین آنکھیں خمار سے بوجھل ہو گئیں۔

دیکھا تو ہر سمت ارم کے خیالی پیکر تھرک رہے تھے۔ کتنی دیر وہ کھویا کھویا بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور باہر آ گیا۔

دھیرے دھیرے چلتا ہوا ارم کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ پردہ ہٹایا۔ تیز برقی روشنی سے کمرہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ سامنے چھوٹے سٹینڈ کے ایزل پر ارم ایک نامکمل تصویر کی تکمیل میں منہمک تھی۔

دبیز قالین کی وجہ سے ثاقب کے قدموں کی چاپ اس کی محویت میں مخل نہ ہوئی۔ اور اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی پشت پر کوئی غائر نظروں سے اس کے اور تصویر کے جائزے میں مصروف ہے۔

چونکی تو اس وقت جب ثاقب جھک کر اس کے ہاتھ میں پکڑے برش کو اپنے ہاتھ میں تھام چکا تھا۔

''نہیں ارم! یہ رنگ تصویر کے حسن کو غارت کر دے گا۔''

ایک لمحے کے لیے وہ سٹپٹا گئی۔ اور اگلے لمحے اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ شہابی ہو اٹھی۔

ثاقب تصویر میں دوسرا رنگ بھر رہا تھا۔ وہ کبھی تصویر کو اور کبھی اسے دیکھ رہی تھی۔ برش نہایت تیزی اور مشتاقی سے کینوس پر چل رہا تھا۔ رنگوں کا امتزاج بھی بڑا حسین تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔

''واقعی ثاقب ہرفن مولا ہے۔''

ثاقب جب خاکہ مکمل کر چکا تو ارم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''فیصلہ کرو! میرے منتخب رنگ تصویر کے حسن میں اضافے کا موجب بنے ہیں یا نہیں۔''

لہجے میں اپنائیت تھی۔ بے پایاں خلوص تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اسے احساس نہ ہوا کہ ان کے درمیان کبھی نفرت بھی تھی۔ وہ ایک دوسرے پر طنز کے تیر بھی برساتے تھے۔ سب باتوں پر خواب کا سا گمان پڑتا تھا۔

''بتاؤ نہ ارم!۔۔''

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بدستور مسکرا رہا تھا۔ نگاہوں میں پیار تھا۔

شوخی سے ارم کی آنکھیں چمکیں، اس نے ثاقب کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور جلدی سے بولی۔

''آپ کو تصویر کشی کی الف ۔۔ بے کا بھی پتہ نہیں۔'' فضا ثاقب کے بھرپور قہقہے اور ارم کی مترنم ہنسی سے گونج اٹھی۔ اس قہقہے اور ہنسی میں سب کچھ بہہ گیا تھا۔ طویل عرصے کی خاموشی ختم ہو گئی تھی اور فاصلے آن واحد میں سمٹ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ارم اسے دوسری تصاویر دکھا رہی تھی۔ ثاقب تعریف کے ساتھ ساتھ اسے ان کی فنی خامیوں کے متعلق بھی سمجھاتا رہا۔ کھانے کے بعد نجم اور سہیل کے اصرار پر ثاقب کے کمرے میں کیرم بورڈ کھیلا گیا۔

اور جب ارم جانے کے لیے اُٹھی تو ثاقب نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ رات میری زندگی کی حسین ترین رات ہے۔ارم! میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

''اور میں بھی آپ کی شکرگزار ہوں۔''

اس نے شوخ شوخ نظروں سے ثاقب کو دیکھا اور تیزی سے کمرے سے بھاگ گئی۔''

باب نمبر:۳۰

''ثاقب اس وقت تمہارا طیارہ برف پوش پہاڑیوں، گل پوش وادیوں اور بلند بالا کوہساروں پر سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن ہوگا۔خوش آیند مستقبل کا تصور ڈھیرے ڈھیرے تمہاری آنکھوں میں دھنک جیسے رنگ بکھیر رہا ہوگا۔۔۔۔۔

خدا کرے وہ عزائم جو تمہارے سینے میں مچلتے ہیں۔پورے ہوں، تم جو دیارِ غیر میں پاکستان کے وقار کو اپنی خداداد قابلیت کے سہارے سربلند رکھنا چاہتے ہو، کامیابی حاصل کرو۔کامرانیوں کی گھنی چھاؤں تلے دو سال گزار کر جب تم واپس پاکستان آؤ تو وہ خاکے جن کے عکس تم نے مجھے دکھائے ہیں تکمیل سے ہمکنار ہو چکے ہوں۔(امین)

وہ دریچے سے باہر فضا میں دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں خود سے باتیں کر رہی تھی۔ایک لمحے کے لئے اس نے یاسمین کی کلیوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی بے خود و مدہوش چاندنی کو دیکھا۔

دل میں اداسی کی لہر اٹھی۔

چوبیس گھنٹے قبل وہ اس کے ساتھ پائیں باغ کی انہی خوبصورت روشوں پر چہل قدمی میں مصروف تھا۔ چار گھنٹوں تک مختلف موضوعات پر اس سے تفصیلاً باتیں کرتا رہا۔ ارم کی جہازوں سے دلچسپی دیکھتے ہوئے اس نے جہازوں، کیڈٹ کی طرز زندگی، کمیشن کے بعد پائلٹ کے فرائض کے متعلق اسے بتایا۔

اور جب دونوں جانے کے لئے اٹھے۔۔۔ تو ثاقب اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

''ارم! میری امی کو میری کمی تو محسوس نہ ہونے دو گی۔''

ارم کی نگاہوں میں ثاقب کی اس بات پر درد سا ابھرا۔۔۔۔ شا کی نگاہوں سے اس نے ثاقب کی طرف دیکھا۔

''ثاقب۔۔۔۔! آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں مجھے امی کا کوئی خیال نہیں۔''

اس کے اندرونی کرب کو ثاقب نے بھی محسوس کیا۔

''مجھے افسوس ہے ارم!۔۔۔۔ لیکن امی میری کمزوری ہیں۔''

برآمدے میں تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے رہے۔۔۔ خاموش، گنگ سے۔۔۔۔ جذبات کا ایک ریلا تھا جو انھیں بہائے لئے جا رہا تھا۔ نگاہیں پل بھر کے لئے اٹھیں۔۔۔۔ ملیں، اور کتنے ہی خاموش پیغام دھڑکنوں کے ساتھ قلب میں اترتے چلے گئے۔ شفاف موتیوں کے قطرے ارم کی پلکوں پر نمودار ہوئے اور ثاقب کو بے چین کر گئے۔

''نہیں ارم!۔۔۔۔ میری کامرانی کے لئے دعا کرنا۔''

''خدا حافظ!۔۔۔۔ وہ اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے بوجھل دل و ماغ کے

ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔۔۔۔

روشن اور اجلی صبحیں شاموں میں ڈھلتی گئیں۔۔۔۔۔ گہری شامیں اور دبیز تاریکی لئے راتیں صبحوں کے دامنوں میں سمٹتی گئیں۔

چودہ، پندرہ دن بعد ثاقب کا خط آتا۔ ارم کو وہ الگ خط لکھتا۔ خلوص اور دوستانہ رنگ میں لکھے گئے یہ خطوط امریکہ کی طرز معاشرت وہاں کے رسوم و رواج اور خود اس کے اپنے محسوسات پر مشتمل ہوتے۔ سادگی لئے یہ خطوط جن کے آخر میں اپنائیت سے بھرپور ایک جملہ ہوتا۔ ''ارم تم کیسی ہو؟'' یہ جملہ اس کی روح کو سرشار کر جاتا۔۔۔۔۔ کانوں میں کتنی بار یہ جملہ گونجتا اور رہ رہ کر وہ اپنے قلب میں میٹھی میٹھی دھڑکنیں محسوس کرتی۔

لیکن اس کا چھٹا خط جو ارم کو وصول ہوا۔ اسے بے قراری سے ہمکنار کر گیا۔

نصف سے زیادہ خط جین نامی کسی حسین لڑکی کے تذکرے سے پر تھا۔

جین !۔۔۔۔۔

جس کی نیلی آنکھیں ایسی گہرائی لئے ہوئے ہیں۔ جس کے سنہرے بالوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنوں کا گمان پڑتا ہے.......... مخلص جین جس کا خلوص ثاقب کے لئے دیار غیر میں تقویت کا باعث تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔۔۔۔۔ نڈھال سی ہو کر اس نے سر میز کے کنارے سے ٹکا لیا۔

وہ اس ملک میں تھا جہاں عریاں حسن اپنی تمام تر حشر سامانیوں سے دعوت نظارہ دیتا ہے۔ سامان تعیش قدم قدم پر دل کا دامن کھینچتا ہے۔ سازگار ماحول ان جذبات کو اور ہوا دیتا ہے۔۔۔۔۔ ایمان لرزتا ہے۔۔۔۔۔ اور اخلاقی اقدار منہ کے بل زمین پر آ رہتی ہیں۔ تب۔۔۔۔۔ کسی کی حسین امید دم توڑ دیتی ہے۔۔۔۔۔ اور دیار مغرب سے

واپس آنے والے نوجوان ایک عدد دم چھلے کے ساتھ واپس آتے ہیں۔

اور پھر دو تین دن بعد اسے اس کا دوسرا خط ملا۔وہی اپنائیت کا گہرا احساس ،شوخ شگفتہ و شاداب گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا۔۔۔۔۔۔ہر لفظ ،ہر جملہ پھول کی پنکھڑی کی دل و دماغ کو لطافت کا احساس بخشتا ہوا۔

اس میں کسی جین کا تذکرہ نہ تھا۔

''کہیں یہ مذاق نہ ہو۔۔۔۔۔اس کی شوخ و چلبلی طبیعت نے ستانے کے لئے یہ نیا راستہ نہ ڈھونڈ نکالا ہو۔''

مذاق گہرائی پکڑتا گیا۔۔۔۔۔چکر پھیلتا گیا۔اور وہ کسی اعصابی مریض کی طرح نظر آنے لگی۔

ہر خط میں کوئی نئی جین ہوتی۔حسین مرمریں بانہوں اور گداز جسم والی۔۔۔۔جس کے ساتھ وہ رقص کرتا۔۔۔۔۔جس کی قربت میں اس کی حسین شام اور بھی رنگین ہو جاتی۔

اور تین چار دن بعد فوراً ہی اسے اس کا دوسرا خط ملتا جس میں کسی ایملے یا کسی مارگریٹ کا تعارف نہ ہوتا۔سادہ سا پر خلوص خط۔!

وہ جل کر کوئلہ ہو جاتی۔کچھ سمجھ نہ پاتی۔ذہنی الجھاؤ آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔وہ کسی کام کو یکسوئی اور دلجمعی سے نہ کر پاتی۔

بجلیاں گراتے حسن کے شعلے اسے سات سمندر پار سے بھی جلا کر خاکستر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔

عدم توجہی اس کے ہر کام میں نمایاں تھی۔کوئی کتاب پڑھنے بیٹھتی تو حروف گڈمڈ ہونے لگتے۔ہر صفحہ پر ثاقب کسی جینی،کسی جولیا کسی ازابیلا کے بازوؤں کے سہارے رقص کرتا دکھائی دیتا۔اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا نظر آتا۔۔۔۔وہ سلگ

اٹھتی، تڑپ کر کتاب میز پر پٹخ دیتی اور آنکھیں بند کر لیتی۔

اگلا خط اس سلگتی آگ کو اور ہوا دیتا۔ خوب شعلے بھڑکتے ۔۔۔ لیکن اس کا پر خلوص سا خط اس آگ پر ہلکی ہلکی پھوار کا چھینٹا دے ڈالتا۔ آگ بجھتی تو نہ لیکن اس کی تپش اور حدت میں قدرے کمی ہو جاتی۔ یہ خیال ۔۔۔۔ یہ احساس ۔۔۔۔ یہ اندازِ فکر، ہوسکتا ہے وہ اس سے مذاق کر رہا ہو ۔۔۔۔

اسے خط لکھتے وقت کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اسے لکھ ڈالے۔

''ثاقب! ۔۔۔ تم میری حسین امید ہو ۔۔۔ پیاری سی آس ہو۔ خوبصورت سا احساس ہو ۔۔۔۔ تمہارے یہ دل شکن خطوط پڑھ کر میری آس دم توڑنے لگتی ہے..... امیدوں کے روشن چہرے پر اداسی مسلط ہو جاتی ہے ۔۔۔۔۔ اور روح غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے۔ ثاقب مجھے بتادو کہ یہ مذاق ہے ۔۔۔۔ صرف مذاق ۔۔''

لیکن ایسا لکھنا وہ اپنی توہین تصور کرتی تھی۔

جواباً وہ اسے اتنی اچھی دوست رکھنے پر مبارکباد لکھ ڈالتی۔ لااُبالی اور لاپرواہ انداز میں ۔۔۔۔۔ یوں جیسے اس نے کوئی اثر ہی نہ لیا ہو۔

ذہنی کشمکش رنگ لائی۔ ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان میں وہ فیل ہوتے ہوتے بچی گھر والے اس کے نتیجہ سے حد درجہ بددل ہوئے۔ وہ خود بھی بہت پریشان تھی۔ گھر والوں کی دل شکستہ باتیں اس کے مجروح احساسات پر تازیانے کا کام کر رہی تھیں۔ تنہائی میں اندر کا پکتا ہوا لاوا پھوٹ نکلا۔ اور اس شدت سے پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ معلوم ہوتا تھا اس کا سارا وجود آنسوؤں میں ڈوب کر بہہ جائے گا۔

کچھ دنوں بعد ثاقب کا خط ملا۔ خط کو ہاتھوں میں تھامتے ہی اس کی آنکھوں سے دکھ کا گہرا احساس چھلک پڑا ۔۔۔۔ پیشانی تن سی گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی دکھی

نظریں خط پر جمی رہیں۔

ہاتھ خط کھولنے کے لئے مچلے لیکن تلخ اور کرب ناک احساس نے انہیں روک دیا۔

وہ شریں حروف کا خط کہاں تھا۔اس میں تو دہکتے انگارے تھے۔۔۔۔۔انگارے۔۔۔۔۔جو خط سے نکلتے ہی اس کے ذہن سے چمٹ جاتے۔جنھیں ذہن سے کھرچنے کے لئے اس کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوتی۔

اور وہ شدت کرب سے تڑپتی رہتی۔

پل بھر کے لئے اس نے کچھ سوچا۔۔۔۔۔اداس اداس نظروں سے خط کو دوبارہ دیکھا۔

اور دوسرے ہی لمحے وہ خط کو کھولے بغیر پھاڑ رہی تھی۔۔۔۔اس کے پرزے پرزے کر رہی تھی۔۔۔۔۔ننھے ننھے پرزے۔

''اس کے ہر خط کا آئندہ بھی یہی حشر ہوگا۔۔۔۔۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے خط کے پرزے پھونک مار کر ہوا میں اڑا دیئے۔

باب نمبر:۳۱

شدید تھکن سے چور ہو کر رفعت نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔گزشتہ دو تین دن وہ ارم کے کاموں میں پھنسی رہیں۔ارم ٹرپ پر سوات جا رہی تھی۔صبح انہوں نے اس کی چیزوں کو پیک کیا۔پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے ساتھ لے جانے کے لئے ناشتہ تیار کیا۔کاموں کی اس مسلسل دوڑ نے انہیں خاصا تھکا دیا تھا۔اب اسے رخصت کرنے کے بعد وہ آرام کے لئے نیم دراز ہو گئیں۔

وقت نے اپنا سارا وقار ان کے چہرے پر نثار کر دیا تھا۔پروقار شخصیت فوراً لوگوں کی توجہ کھینچ لیتی۔نگاہوں سے احترام ٹپکتا۔اور سر اس عظیم ہستی کے سامنے سرنگوں ہو جاتا۔

آنکھیں بند ہوئیں اور طائر خیال اس دنیا میں پہنچ گیا۔جہاں لخت جگر مقیم تھا۔ثاقب سے جدا ہوئے تین سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔

تین سال۔۔۔۔۔تین صدیاں۔

ان کی مصائب اور دکھوں سے بھرپور زندگی پرحاوی یہ تین سال۔
فرقت کی ان کٹھن گھڑیوں میں چند بار خوشگوار لمحات بھی آئے۔
غم جدائی کی تند و تیز ہوائیں بہار کے خوشگوار جھونکوں میں بھی بدلیں۔

ان کے بیٹے نے اپنی خدا داد صلاحیتوں کا اعتراف امریکہ کے تجربہ کار اور مشہور ہوابازوں سے بھی کرایا۔

جہاز کو آواز سے زیادہ رفتار سے اڑا کر لرزا دینے والا دھماکے کرنے مختلف زاویوں سے زمینی ٹھکانوں پر گولیاں برسانے، راکٹ اور گن فائرنگ، غوطہ مار کر بمباری کرنے، جیٹ طیارے کو الٹا چلانے لٹو کی طرح گھمانے اور عمودی پروازوں میں اس نے ماہرین سے منوالیا کہ وہ پیدائشی ہواباز ہے۔

ہوابازی کے ہر مقابلے میں اس نے اول انعام حاصل کیا۔ ''ڈائمنڈ فارمیشن لوپ'' اور ''بیٹ اپ'' کے مظاہرے نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔

اس کی تصاویر سیر بین (Panorma) میں چھپیں۔ پاکستان کے اخبارات نے جلی حروف میں اس کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔

آج کل وہ یورپ کی سیر کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں جو اس کا خط آیا تھا وہ جنیوا سے تھا۔
انتظار کی طویل مدت کٹ گئی تھی اور دیدار کی گھڑی قریب آن پہنچی تھی لیکن جانے ابھی کتنے دن اور شمع انتظار کو جلنا تھا۔

غنودگی کا ہلکا ہلکا غبار ان پر چھانے لگا تھا کہ باہر سے شور غل کی آوازوں نے انہیں جگا سا دیا۔ آنکھیں پوری طرح کھولے وہ اس شور و غوغا کی نوعیت جاننے کی کوشش کرتی رہیں۔ اور جب کچھ نہ سمجھ پائیں تو باہر کی طرف لپکیں۔

دل کی ساری محبت سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی۔ ممتا کے لازوال نور سے ان کا چہرہ

دمک اٹھا۔

انتظار کے جان لیوا لمحے بیت گئے تھے......بیٹا درخشاں مستقبل کی سنہری پٹی پیشانی پر سجائے دیارِ غیر سے واپس آ چکا تھا۔

آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہہ نکلے۔بیٹے کے سر کو ہاتھوں میں تھام کر محبت بھری نگاہ ڈالی۔

ہمایوں کی یا د تند و تیز لہر کی طرح اٹھی۔وہ بالکل ہمایوں تھا۔

زخموں کی جھلی پھٹ گئی اور خون رسنے لگا۔آنسوؤں کے سوتے ابل پڑے۔

ثاقب خود بھی آبدیدہ ہو گیا۔ماں کے دکھوں سے بخوبی واقف تھا۔عصمہ رو رہی تھیں۔۔۔۔۔۔۔بچے رو رہے تھے۔۔۔۔۔نوکروں کی آنکھیں نم تھیں۔

اشکوں کا طوفان تھما۔ثاقب کے قہقہے فضا میں گونجے تو سب کے چہرے مسرت و شادمانی سے روشن ہو گئے۔

رات کو رفعت نے بیٹے سے ان خطوط کی صداقت کے بارے میں پوچھا۔جو وہ ارم کو لکھتا تھا۔متفکرانہ انداز میں ان کے انداز پرسش پر ثاقب اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔کھلکھلاتے ہوئے ماں کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''امی وہ تو مذاق تھا۔اسے پریشان کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ثاقب کے متعلق آپ ایسا سوچ سکتی ہیں؟میں نے آپ کو لکھا بھی تھا۔۔۔۔۔''

''نہیں بیٹے یہ بری بات ہے۔پیار میں بدگمانیاں بہت جلد جنم لے لیتی ہیں۔''

''وہ واپس کب آ رہی ہے؟''ثاقب نے پوچھا۔

''ہفتے کو۔۔۔۔۔''

ہفتہ کی شام کو وہ پائیں باغ میں سہیل کے ساتھ باتوں میں محو تھا۔اجالے دبے

پاؤں جب رخصت ہونے لگے اور تاریکی ہر سو پھیلنے لگی تو اس نے انگڑائی لی اور اٹھنا چاہا۔
نگاہیں اٹھیں تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے شام کے ان ملگجے اندھیروں میں برق کوند گئی ہو۔

ارغوانی ساڑھی میں لپٹی ارم خراماں خراماں آگے بڑھ رہی تھی۔
تین سال قبل کی ارم اگر حسن و رعنائی کے لحاظ سے رنگین قمقمہ تھی تو آج کی ارم حسن کا لپکتا ہوا شعلہ بن چکی تھی۔

شدت سے جی چاہا کہ وہ اپنے درمیان حائل فاصلے ایک ہی جست میں طے کر جائے۔اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے کانوں کے پاس اپنا منہ لے جائے اور تب دھیرے سے یہ کہے۔

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جایئے

وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔تیز قدموں سے رفعت کے کمرے کی طرف چل دیا۔ڈاکٹر صاحب اور عصمہ کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔کمرے کا پردہ اٹھایا تو ارم ان کے گلے سے لپٹی جھول رہی تھی۔

وہ دروازے میں کھڑا تھا۔رفعت کی اس پر نظر پڑی۔پیار بھرے لہجے میں بولیں۔

''آؤ نا ثاقب!۔۔۔۔''

ارم ثاقب کی آمد سے لاعلم تھی۔رفعت کی آواز پر چونک اٹھی۔پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔تین سال میں وہ کتنے فاصلے طے کر گیا تھا۔یورپ کی آب و ہوا نے اس پر کتنا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔بلند و بالا قامت پر اس کا صحت مند جسم، چہرے پر شہزادوں جیسی آن بان اور وقار۔سیاہ شفاف آنکھوں میں تیرتی دلفریب

مسکراہٹ۔

''امی جبین کہاں ہے؟ اس کا تعارف ارم سے کروایئے نا۔'' وہ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے مسکرا دیا۔

''ثاقب!۔۔۔'' ماں کے لہجے میں پیار بھری ڈانٹ تھی۔

وہ دہکتے انگارے جن پر وقت نے ہلکی ہلکی راکھ کی تہہ جما دی تھی۔ ہوا کے ایک ہی جھونکے نے ایک لمحے میں ہی انہیں ازسرِنو دہکا دیا۔ پل بھر میں کتنے ہی رنگ آئے اور اس کے حسین چہرے پر چھا گئے۔ دل و دماغ نے شدید جلن محسوس کی۔

''تم بیٹھو بیٹے!۔۔ میں تمہارے لیے چائے لے آؤں۔'' رفعت نے ارم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ثاقب کی آنکھوں میں پیار کی قندیلیں روشن ہو گئیں۔ معنی خیز مسکراہٹ لبوں پر گہری ہو گئی۔

''ارم جبین سے کب ملو گی؟۔۔۔

انگارے جن کی حدت سے دل و دماغ جھلسا جا رہا تھا۔ ان کی تپش اسے سارے جسم میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ مضطرب ہو اٹھی۔

گزشتہ تمام تلخ باتیں اس کے ذہن میں یکلخت رینگ آئیں۔ غصے سے اس کی طرف گھورتے ہوئے بولی۔

''مجھے جبین کی دید سے دلچسپی ہے اور نہ شوق۔۔۔''

جھٹکے سے وہ مڑی اور آنکھ جھپکتے میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ثاقب کا فلک شگاف قہقہہ اسے کچھ اور تڑپا گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ دھم سے بستر پر گر گئی۔ بے بسی میں آنکھوں سے رم جھم بارش برسنے لگی۔ رات کے کھانے پر وہ موجود نہ تھی۔ ثاقب اس کے

احساسات کو بخوبی سمجھتا تھا اب وہ اسے منانا چاہتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس کے کمرے میں گیا۔ چہرے پر بازو رکھے وہ داہنے رخ لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے۔

''ارم!۔۔۔'' ثاقب نے اس کا بازو آہستگی سے نیچے کیا۔

''ثاقب!۔۔۔'' وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُٹھی۔

اس کا چہرہ سرخ تھا، پپوٹے متورم تھے اور یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ خاصا رو چکی ہے۔

''ارم! تمہیں آخر جینی سے اتنا حسد کیوں ہے؟''

وہ زخم خوردہ انداز میں چلائی۔

''تمہیں مجھ سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں۔۔۔''

''میں تم سے کھیل رہا ہوں ارم! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

اس کی شوخ مسکراہٹ یکدم کافور ہو گئی۔ چہرے پر کرب نمودار ہوا۔

''اس میں کوئی شک ہے؟۔۔۔۔'' وہ سکون سے گویا ہوئی۔

''ارم!۔۔۔ کہنے سے پہلے کچھ سوچ تو لیا ہوتا۔۔'' ثاقب کے لہجے میں درد تھا تڑپ تھی اور سوز تھا۔

''تم سے کھیلنا تو بہت بڑی بات ہے۔ ارم میں نے کبھی ان سے کھیلنے کی بھی کوشش نہ کی جو ٹوٹ کر میرے دامن میں گر رہی تھیں۔ جن کے عریاں حسن کے سامنے ہوش و خرد جواب دیتے نظر آتے تھے۔ اس قیامت کے ماحول میں بھی میں نے خود پر ضبط کیا۔ تم صرف میری ماں کی تمناؤں کا مرکز ہی نہیں۔۔ میرے خواب اور سپنے بھی تمہارے گرد گھومتے ہیں۔۔۔''

باب نمبر:۳۲

ڈوپٹے کا پلو ڈھلک کر گود میں گر گیا تھا۔پاؤں پلنگ کی پٹی سے نیچے لٹک رہے تھے۔چہرے پر دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت رقصاں تھی۔نگاہیں سامنے دیوار پر مرکوز تھیں۔ ذہنی افق پر غلط فہمیوں کی جو دبیز تہیں جم گئی تھیں۔ثاقب کے الفاظ ان میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے تہیں ایک کے بعد ایک غائب ہوتی گئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد خوشگوار روشنی ہر سو پھیل گئی۔ایسی روشنی جو قلب کے لیے سکون بخش تھی۔

وہ خوش تھی بے حد خوش۔۔کیف آور احساس اس کے سارے وجود پر چھایا جا رہا تھا۔ادائے ناز سے اُٹھی۔اور باہر چلی گئی۔گنگناتی فضائیں محسوس کرتے ہوئے اس کا دل جھوم اُٹھنے کو چاہا۔آج اس نے وہ سب کچھ پا لیا تھا جس کی اسے تمنا تھی۔

وہ پیار کا ایک رسیلا نغمہ بن کر فضا میں بکھر جانا چاہتی تھی ایسا نغمہ جو کمرے میں سوئے ہوئے ثاقب کو جگا ڈالے۔اور وہ دلنواز تان پر سحر زدہ انسان کی طرح اس کے پاس پہنچ جائے تب اس کے شانوں پر سر رکھے وہ چپکے سے اس سے کہہ سکے۔۔۔۔۔

''ثاقب!۔۔۔مجھے معاف کردو۔۔۔''

اگلی صبح ناشتے پر ثاقب موجود نہ تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور رفعت نے نوکر کو اسے جگانے کے لیے کہا لیکن عصمہ نے انہیں یہ کہتے ہوئے منع کر دیا۔

کہ وہ رات کو کافی دیر تک پڑھتا رہا تھا اس لیے اسے ابھی سونے دو۔

دوپہر کے کھانے پر بھی وہ موجود نہ تھا۔ ارم سارا دن انتظار کرتی رہی۔ وہ اسے منانا چاہتی تھی۔ کیونکہ اگلے دن وہ اپنی ملازمت پر پشاور جا رہا تھا۔ شام کے قریب وہ آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی چہرے پر شوخی و سنجیدگی کا حسین امتزاج لیے ارم اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پردہ ہٹا کر اس نے اندر جھانکا۔ ثاقب دروازے کی طرف منہ کیے میز پر جھکا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

کچھ دیر وہ متذبذب کی حالت میں وہاں کھڑی رہی۔ دفعتاً ثاقب نے لکھتے لکھتے نگاہ اٹھائی۔ ارم کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر وہ چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر ہلکی ہلکی شکنیں ابھر آئیں جو اس کی ناگواری ظاہر کرنے کے لیے کافی تھیں۔ کچھ سوچ کر ارم آگے بڑھی اور میز کے پاس عین ثاقب کے بالمقابل جا کھڑی ہوئی۔ اس کے لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ روٹھا روٹھا ثاقب اسے بہت ہی پیارا لگا۔

''ثاقب!۔۔۔میں اپنے اندازِ فکر پر شرمندہ ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کیے۔''

''یہ وار کوئی نیا تو نہیں ارم!۔۔۔میں تو زخم کھانے کا عادی ہو چکا ہوں۔ میرے پرخلوص جذبات کو ہر بار پاؤں تلے روندا گیا ہے۔ معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔''

اس کے چہرے پر حزن وملال کے سائے رینگ رہے تھے۔

ارم کا دل پھٹنے لگا۔اس کی حسین آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ان آنسو بھری آنکھوں سے اس نے ثاقب کو دیکھا۔

دماغ میں ایک خیال اُبھرا اور پل بھر میں وہ ذہنی طور پر سارے فاصلے طے کر گئی۔ آگے بڑھی اور اس کے شانوں پر اپنا سر اور بازو رکھ دیئے۔آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے اور ان آنسوؤں کے درمیان وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"میری خطاؤں کی سزا اتنی کڑی تو نہیں ہونی چاہیے۔مجھے ذہنی عذاب پہنچانے میں آپ نے پہلے ہی کون سی کسر چھوڑی ہے۔۔۔۔"وہ رو رہی تھی۔۔۔۔مسلسل روئے جا رہی تھی۔

''وہ ''۔۔۔۔۔جو اس کی محبوب تھی۔۔۔۔اس کی ماں کی جان آرزو تھی۔۔۔۔کیسا غصہ؟ اور کیسی ناراضگی؟۔

آہستگی سے اس کے نرم ونازک وجود کو اس نے بازوؤں میں لے لیا۔اور اس کے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ارم!۔۔۔۔اگر تم مجھے قصوروار سمجھتی ہے تو میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔"

اس کے بالوں سے اڑتی ہوئی دھیمی دھیمی خوشبو اس کے ہوش وحواس پر چھائے جا رہی تھی۔مگر وہ ہوش میں رہنا چاہتا تھا۔۔۔۔آہستگی سے اسے بازوؤں میں تھامے صوفے تک لے آیا۔

وہ خاموش رہی۔

گلابی گلابی رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں اپنے نشان چھوڑ گئی تھیں۔نم پلکوں میں کہیں کہیں ننھے منے موتی اٹکے ہوئے تھے۔

"ارم!۔۔۔۔مجھے اپنی نبض دکھاؤ۔دیکھوں بھلا بخار اتر گیا ہے۔۔۔۔"وہ اب شوخی سے مسکرا رہا تھا۔

ارم بھی اُسے دیکھ کر ہنس دی۔

"میرا تو اُتر گیا ہے،اپنا حال سنائیے۔"

اور پھر وہی ثاقب تھا،وہی ارم۔۔۔۔۔

اس کے وقت کا زیادہ حصہ اب ارم کے ساتھ گزر رہا تھا۔

اس رات چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ارم کا دل باغ میں سیر کرنے کو چاہ رہا تھا۔۔۔ثاقب کے کمرے میں گئی اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔

"رات کے وقت چندا کی چاندنی میں لڑکیوں کو باغ میں سیر کے لئے نہیں جانا چاہیے۔۔۔۔"

"کیوں؟"وہ چل اٹھی۔

"بھوت،پریت عاشق ہو جاتے ہیں۔۔۔"وہ اسی انداز میں بولا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"۔۔۔۔وہ پاؤں پٹختے ہوئے چلائی۔

''یہ بدتمیزی نہیں عین حقیقت ہے۔۔۔کیا ضرورت ہے سیر کرنے کی۔۔۔آرام سے بیٹھ کر پڑھو۔۔۔۔ایف۔ایس۔سی میں تھرڈ ڈویژن لی ہے۔چچا کی سیٹ نہ ہوتی تو تمہیں کہیں میڈیکل میں داخلہ ملنا تھا۔۔۔اور اب کیا۔۔۔۔"

اس نے شوخی سے اسے دیکھتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"شہر کے اندیشے میں قاضی جی کیوں دبلے؟۔۔۔۔"یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔۔۔۔لیکن اس کے دروازے میں قدم رکھنے سے پہلے ہی ثاقب نے اسے پکڑ لیا۔اور پھر گھنٹوں، منتیں خوشامدیں کیں۔تب کہیں جا کر اس کا موڈ درست ہوا۔

تنگ کرنا اور فقرے کسنا اس کی فطرت تھی ۔۔۔۔وہ پارے کی مضطرب رہتا۔اتنے لا ابالی انداز میں باتیں کرتا جیسے لطیف احساسات اسے چھو کر ہی نہ گئے ہوں ۔دن میں دس مرتبہ ارم اس کی کڑوی کسیلی باتوں پر روٹھتی ۔

یوں ہی ایک دن اس نے ثاقب سے پوچھا۔

"ثاقب !۔۔۔تمہیں امریکہ میں سب سے زیادہ کون یاد آیا تھا؟"

اپنے اُلجھے بالوں کو بائیں ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے اور کوٹ کا نشانہ لیتے ہوئے اس نے کس بے نیازی سے کہا۔

"بھئی!۔۔۔۔وہاں زندگی اتنی مصروف تھی کہ کسی کو یاد رکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔"

اور اس سے اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے منوں برف اس کے سینے پر رکھ دی ہو۔۔۔۔وہ یک دم خاموش ہوگئی۔

کتنے ہی مہینے گزر گئے ۔۔۔۔ثاقب پشاور جا چکا تھا۔

وہ اپنی پڑھائی میں گم تھی ۔

اس دن اناٹومی کی کلاس اٹنڈ کر کے باہر نکلی ہی تھی کہ مائیلہ نے مسکراتے ہوئے اُسے گھورا۔

"تم سے کوئی فوجی ملنا چاہتا ہے۔۔۔۔"

تبھی اسے ثاقب کا خیال آیا۔۔۔۔وردی میں آیا ہوگا؟ سوچتے ہوئے وہ مسکرا دی۔۔۔۔تہمینہ پاس کھڑی تھی ۔۔۔۔"ثاقب ہے؟"اس نے پوچھا۔

اور وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر بھاگی۔

وہ ایک پاؤں پٹڑی پر رکھے،فلیٹ کیپ ہاتھوں میں پکڑے کس شاہانہ انداز میں

کھڑا تھا۔وردی میں اس کی وجیہہ شخصیت کس درجہ حسین نظر آ رہی تھی۔۔۔۔مسرت کا احساس آنکھوں کے حُسن کواور بھی دلکش بنارہا تھا۔

پلکیں جھپکاتی ہوئی وہ اس کے قریب پہنچ گئی۔اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ کھل سا اٹھا۔مخصوص انداز میں بولا۔

"ہیلوڈاکٹر!ٹھیک ہونا؟۔۔۔"

"آپ کب آئے؟"اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"عین اسی وقت جب تم نے دیکھا۔۔۔۔"وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"کتنے دنوں کی چھٹی ہے؟۔۔۔۔"

دو گھنٹوں کے لئے جہاز لے کر لاہور آیا تھا۔۔۔۔ابھی واپس جارہا ہوں۔۔۔۔"

اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا۔کنج میں بیٹھے لڑکے گردنیں اٹھائے اس حسین جوڑے کودلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔غیرارادی طور پراس نے پیچھے دیکھا۔

کوریڈور میں کھڑی لڑکیاں معنی خیز نگاہوں سے انہیں گھور رہی تھیں۔آنے جانے والوں کودیکھا۔۔۔ہرلڑکا۔۔۔لڑکی گزرتے سمے انہیں ضرور دیکھ کرگزرتا۔۔۔۔اس کی پیشانی عرق آلودہوگئی۔۔۔۔حجاب سے چہرہ سرخ ہوگیا۔

غصہ آیا۔۔۔۔

بےاختیارسوچا۔

"کالج آکر مجھےنشانہ تضحیک بنانے کی کیاضرورت تھی؟اب واپس جاؤں گی تو لڑکیاں مذاق کے تیروں سے تکابوٹی کرڈالیں گی۔۔۔۔"

"آپ کوکالج نہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔۔"اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آہستگی

سے بولی۔

"خود کو اتنی اہمیت کب سے دینی شروع کر دی ہے ارم؟ میں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔۔۔۔واپسی پر یونہی خیال آیا کہ تمہیں بھی دیکھتا جاؤں۔۔۔۔" ثاقب کا جواب اپنے اندر طنز سموئے ہوئے تھا۔

وہ تو اتنی سی بات کہہ کر چور بن گئی۔

شرمندگی کے آنسو اس کی آنکھوں میں امنڈ آئے۔اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔لوگ کیا کہیں گے کیا سوچیں گے؟ ان احساسات کی زنجیریں خاصی مضبوط تھیں۔۔۔۔جنہیں توڑنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

وہ اس سے کچھ دیر اور باتیں کرتا رہا۔۔۔۔اسی شگفتگی سے جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ہر مصلحت سے بے نیاز جیپ نے ہارن دیا اور وہ چونک اٹھا۔

"اچھا خدا حافظ!" اس نے ارم کی آنکھوں میں جھانکا۔مسکرایا۔۔۔۔ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر ایسے لہجے میں گویا ہوا۔جس میں دل کی ساری محبت سمٹ کر آ گئی۔

"ارم! میں صرف تم سے ملنے کے لئے یہاں آیا تھا۔لاہور آ کر تمہیں دیکھے بغیر چلے جانا ثاقب کے لئے ممکن نہیں۔۔۔۔"

اپنی بات کا ردعمل اس کے چہرے پر دیکھے بغیر تیزی سے جیپ کی طرف بڑھا اور اس سے پہلے کہ ارم کچھ سوچ سکے وہ جیپ سٹارٹ کر کے گیٹ سے باہر جا چکا تھا۔

ارم کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

کوریڈور کے ستونوں سے ٹکرا کر سر پھوڑ لے۔

وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش تھا۔لیکن اس کی ان باتوں کا کیا کیا جائے جو کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح اس کے نازک احساسات پر پڑتیں اور انہیں پاش پاش کر جاتیں۔

باب نمبر:۳۳

دھپ سے ایک گول مٹول چیز میز پر آ رہی ۔۔۔۔پڑھائی میں محو ارم ڈر گئی۔۔۔۔ابھی کچھ سوچنے سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ دو ہاتھ اس کی آنکھوں پر آ گئے ۔۔۔۔۔وہ یکدم گھبرا گئی ۔تیز لہجے میں بولی ۔

"سہیل باز آؤ ۔۔۔۔۔پٹنے کا ارادہ ہے کیا مجھ سے؟"

لیکن ہاتھوں کی گرفت کچھ اور بھی سخت ہو گئی ۔فضا میں "یوڈی کلون" کی مانوس سی خوشبو پھیل رہی تھی ۔شک گزرا ۔لمبا سانس کھینچا۔شک یقین میں بدل گیا تھا۔پھر اٹھی ،تیز لہجے میں بولی ۔

"ہاتھ ہٹا لیجئے ورنہ ۔۔۔۔۔"

"ورنہ ۔۔۔۔تھری ناٹ تھری کی گولی سینہ میں اتر جائے گی ۔۔۔۔"

قہقہہ لگاتے ہوئے ثاقب نے ہاتھ ہٹا لئے ۔

ایک بار بھی ارم نے نگاہیں اٹھا کر نہ دیکھا۔وہ اس سے شدید ناراض تھی۔اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ثاقب میز پر جھک گیا۔۔۔۔صاف کاغذ اٹھایا۔۔۔۔۔اس کے ہاتھ سے قلم چھینا اور" کاغذ پر سے ہاتھ ہٹا لیجئے، ورنہ۔۔۔۔۔" لکھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"خالی جگہ مناسب الفاظ سے پُر کیجئے۔"

ارم نے کاغذ پھاڑ ڈالا۔اور بگڑتے ہوئے بولی۔

"فضول باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔"

اس کے کڑوے کسیلے لہجے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ خوش دلی سے بولا۔

" تمہیں کس سرپھرے نے ڈاکٹری پڑھنے کے لئے کہا تھا؟"

" کیا مطلب؟۔۔۔"وہ جلے ہوئے انداز سے بولی۔

"مطلب تو واضح ہے۔۔۔۔دماغ تو پہلے ہی الٹا تھا اس پر ستم یہ کہ ڈاکٹری پڑھ رہی ہو۔۔۔کریلا اور نیم چڑھا والی بات ہے۔جس غریب کے پلے بندھو گی، اس کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔"

آ"پ بہت بے لگام ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔"وہ تنتناتے ہوئے اٹھ کر جانے لگی۔مارے غصے کے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔۔۔۔

ایک ہی جست میں وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں تھے۔بالوں کی گھنی لٹ پیشانی پر کھیل رہی تھی۔آنکھوں سے شوخی نمایاں تھی۔

"تم ہی پھوہڑ ہو ورنہ۔۔۔۔لگام ڈھیلی ہونے کا مطلب۔۔۔؟"

" ثاقب!۔۔۔"وہ چیخی۔

"ہٹیے!۔۔۔۔مجھے جانے دیجئے۔۔۔"اس کے انداز میں برہمی نمایاں تھی۔

"چچ، چچ ۔۔۔۔اتنا شدید غصہ چہرے پر پہلے ہی بارہ بجے رہتے ہیں اور اب بالکل سوا بارہ ہو رہے ہیں۔ وہ اس کی طرف ہلکا سا جھکا۔

مارے غصے کے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

" کہتے ہیں عورت، آنسو مرد کو مرعوب اور متاثر کرنے کے لئے بہاتی ہے۔کیوں ارم یہ سچ ہے؟"

اب تو اس کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔۔۔کڑکتے ہوئے بولی۔

" بکواس کرتے جایئے یہاں بیٹھ کر۔۔۔۔"اور دروازے کی طرف بڑھی۔

لیکن ابھی اس نے شاید ایک دو قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ ثاقب نے اس کو شانوں سے پکڑ لیا۔

"ہماری بکواس دیواروں کے لئے نہیں ہے۔"

"چھوڑیئے مجھے!"۔۔۔۔۔وہ بل کھاتے ہوئے تڑپی۔

"ہمارے حکم کے بغیر آپ اس کمرے سے ایک قدم باہر نہیں نکال سکتیں۔۔۔۔"

"آپ کون ہیں حکم دینے والے؟۔۔۔۔"

"ہم ہیں ونگ کمانڈر ثاقب ہمایوں۔۔۔۔"

"صورت دیکھی ہے اپنی؟۔۔۔۔"

"جی ہاں!۔۔۔۔آپ سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔"

اسے ستانے، ستا ستا کر رلانے اور جی بھر کر جلانے، میں خاص لطف محسوس ہوتا۔۔۔۔وہ اتنی خودسر اور ضدی لڑکی تھی، جو کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔۔۔۔ناپسندیدہ بات پر گھر والوں کو ناکوں چنے چبوا دیا کرتی مگر ثاقب کے سامنے کبھی کبھار وہ اتنی بےبسی محسوس کرتی کہ جواب نہ بن پڑتا۔

اس دن بھی تقریباً دو گھنٹے وہ اس کے ساتھ الجھتا رہا پھر اسے مناتا رہا۔وہ دن رہا اور ان دو دنوں میں اس نے ارم کا قافیہ تنگ کئے رکھا۔

کالج میں تقریری مقابلوں کا موسم شروع ہو گیا تھا۔۔۔۔۔تقریری مقابلے کے سلسلے میں چند لڑکیاں اور لڑکے پشاور یونیورسٹی جا رہے تھے۔

ارم بھی ان میں شامل ہو گئی۔صبح پشاور پہنچتے ہی ارم نے ثاقب کی ونگ میں فون کیا۔۔۔۔۔معلوم ہوا کہ وہ فلائٹ پر ہے۔سفر کی تکان غالب تھی سو گئی اور اس وقت جاگی جب تہمینہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔

"ارم یہاں مارلن منرو کی فلم چل رہی ہے۔آج شام اس کا آخری شو ہے۔چلو دیکھ کر آتے ہیں۔۔۔۔۔"

"بھاڑ میں جائے منرو۔۔۔۔۔میں تو میں آفیسرز میس جاؤں گی۔۔۔۔۔"

"اللہ رے بے تابی!۔۔۔۔۔ثاقب کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا۔۔۔۔۔واپسی پر میس اتر جائیں گے۔۔۔۔"

تہمینہ کی ضد پر اُسے جھکنا ہی پڑا۔جانے سے پیشتر اس نے ایک بار فون کیا لیکن نمبر نہ مل سکا۔

تہمینہ نے اسے ڈانٹا۔

"اتنی بھی کیا بے قراری ارم؟"

آخر ارم، تہمینہ اور ضیاء گل تینوں سینما کے لئے چل دیں۔گیلری کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ارم نے کسی قدر حیرت سے اس نوجوان کو دیکھا۔جس کی پشت دیکھ کر اسے سو فیصد ثاقب کا گمان ہو رہا تھا اس کے ساتھ ایک معمر خاتون تھیں اور ایک تراشیدہ بالوں والی جوان لڑکی بھی۔۔۔۔۔لڑکی اس کے ساتھ ساتھ تیزی سے چل رہی تھی۔۔۔۔۔وہ گم سم

سی ہوگئی۔

ہال میں داخل ہوتے ہی اس نے متجسس نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک پَل میں سارے ہال کا چکر لگا کر تصدیق کرے کہ وہ ثاقب تو نہیں ہے۔

حسین آنکھوں میں شک وشبہات کی گہری پرچھائیں لئے اس کی نگاہیں والہانہ انداز میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔

تہمینہ اور ضیاء گل کے پیچھے پیچھے وہ آگے بڑھ رہی تھی۔اور تبھی اسے یوں لگا جیسے ہال میں روشن قمقمے یک دم بجھ گئے ہوں۔آنکھوں کے سامنے گھٹا ٹوپ اندھیرے محسوس ہوئے۔

وہ اندھیرے جن میں پیار کے روشن آفتاب کی کرنیں دم توڑ دیتی ہیں۔

مقدر کی تابنا کیوں کو گہن لگ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔اور خوابوں کے شیش محل چھنا کے سے فرش پر آ رہتے ہیں۔

اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔۔۔جانے وہ کس طرح سیٹ پر بیٹھی۔۔۔۔۔دماغ کی اڑان کسی خوفناک آندھی سے بھی تیز تھی۔۔۔۔۔دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی۔۔۔۔۔ناقابل برداشت ٹیس۔۔۔۔گزشتہ ساری باتیں یکے بعد دیگرے یاد آتی گئیں۔

قول وفعل میں اتنا تضاد۔۔۔۔۔

زخمی نگاہوں سے اس نے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔وہ تینوں نہ جانے کس بات پر ہنس رہے تھے۔

عین اسی لمحے ثاقب کی آنکھوں میں تحیر رونما ہوا۔اسے اپنی بصارت پر شبہ

ہوا۔لیکن وہ شبہ کب تھا؟وہ بصارت کا دھوکہ کب تھا؟وہ ارم ہی تو تھی ۔۔۔۔۔اس کی اپنی ارم۔۔۔۔وہ اسے ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔تیزی سے اٹھا اور آنکھ جھپکتے میں وہ اس کے سامنے تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر!تم یہاں کیسے؟۔۔۔۔۔"

اس کے چہرے کی تلخی۔۔۔آنکھوں میں ناچتے رقابت کے شعلے۔۔۔۔۔بیزاراور اکتاہٹ،ثاقب سے ایک مکمل داستان کہہ گئے تھے۔

وہ مسکرا اٹھا۔۔۔آنکھوں میں شوخی لہرائی۔

"ارم!۔۔۔۔وہ میرے گروپ کیپٹن کی بیگم اور صاحبزادی ہیں۔۔۔۔۔بہت مہربان ہیں مجھ پر۔۔۔۔کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔اڑانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔۔۔مجھے لیکن ہم بھی انہیں بتانے والے ہیں کہ ہمارے دل پر" نو ویکنسی" کا بورڈ آویزاں ہے۔۔۔کوشش رائیگاں جائے گی۔دیکھو جلنے اور کڑھنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔"

"خدایا تیرا شکر ہے کہ ارم کی بے قراری کو قرار آیا۔۔تہمینہ ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

ہال میں لائیٹس بجھ گئی تھیں۔ٹریلرز دکھائے جا رہے تھے۔

"اچھا خدا حافظ! پکچر کے بعد ملوں گا۔۔۔"

وہ دوبارہ انہی خطرناک عزائم رکھنے والی خواتین کے پاس جا کر بیٹھ چکا تھا۔

اور وہ سینما کی دیواروں سے سر پھوڑ لینا چاہتی تھی۔۔۔۔۔جی چاہتا تھا کہ اسے روک لے۔اسے گریبان سے پکڑ کر یہ کہے کہ "تم جو میری اتنی سی بات پر سیخ پا ہو گئے تھے۔۔۔اب کہو۔۔۔تمہاری اصلیت کیا میرے سامنے نہیں آ گئی؟"

لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی ۔ دائیں طرف تہمینہ تھی اور بائیں ہاتھ کوئی معزز خاتون ۔
پکچر شروع ہو چکی تھی ۔ لیکن اسے کچھ ہوش نہ تھا ۔ دل میں جلتی آگ اس پر بے
ہوشی طاری کر رہی تھی ۔ دل گھبرایا ۔ تہمینہ کا ہاتھ دبا کر اس نے کہا ۔

"میں ہوسٹل جا رہی ہوں ۔۔۔۔۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے ۔"

اور اس سے پیشتر کہ تہمینہ اسے پکڑتی ۔ وہ قریبی دروازے سے باہر نکل چکی تھی ۔

وہ جانتی تھی کہ وہ آئے گا ۔ چنانچہ اس نے سامان سمیٹا ۔ ناہید کو واپس لاہور جانے
کے متعلق بتایا اور ائیر پورٹ روانہ ہو گئی ۔

خوش قسمتی سے جہاز لاہور آنے کے لئے تیار تھا ۔ اس نے سیٹ بک کروائی اور
پندرہ منٹ بعد وہ لاہور کی طرف محو پرواز تھی ۔

باب نمبر:۳۴

دریچے سے سر لگائے آنکھیں بند کئے وہ جانے کب سے کھڑی تھی؟ تین روز قبل وہ جس طوفان سے دوچار ہوئی تھی۔وہ اب رفتہ رفتہ سکون پر آ رہا تھا۔لیکن اس دم توڑتے طوفان تلے اس کی روح پسی جا رہی تھی ۔کبھی انتقامی جذبات کا جوار بھاٹا اس کے سینے سے ابھرتا اور کبھی بے بسی کی یخ بستہ لہریں اس کے انتقامی جذبات کو منجمد کر جاتیں۔

کوئی کمرے میں داخل ہوا۔لیکن وہ خیالات میں کچھ یوں گم تھی کہ اسے کسی کی آمد کا احساس تک نہ ہوا۔

آنے والے نے اس کی پھیکی پڑتی ہوئی ،گلابی رنگت کو دیکھا۔پپڑیاں جمے سفید ہونٹ اور اداسی میں ڈوبا ہوا چہرہ۔۔۔۔!! آنے والے کی آنکھوں میں ناچتی شوخی یکدم مدہم پڑ گئی۔۔۔۔اداسی کے سائے روشن چہرے پر رینگنے لگے۔۔۔۔زیادتیوں کا احساس روح کو تڑپانے لگا۔

دانتوں سے ہونٹوں کے گوشے کاٹتے ہوئے اُس نے دکھی نظروں سے اسے

دیکھا۔۔۔باہر جھانکا جہاں اندھیرا پھیل رہا تھا۔ستارے جگمگا رہے تھے۔تب اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پُرسوز آواز میں گنگنایا۔

پلکیں تو اٹھاؤ کہ ستاروں کو خبر ہو

ہوتے ہیں کہاں چاندنی راتوں کے بسیرے

شانوں پر ہاتھوں کا دباؤ اور مانوس سی اس آواز پر اس نے چونک کر پلکیں اٹھائیں۔

"اف!" ثاقب تڑپ کر رہ گیا۔

اس کی آنکھوں میں جگمگاتی چاندنی کے اجالے نہ تھے۔۔۔بلکہ دل تڑپا دینے والی اداسیوں کے گہرے سائے تھے۔۔۔

''ارم!۔۔۔مجھے معاف کر دو،میرا مقصد تمہیں ستانا ضرور تھا۔تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہرگز نہیں۔کیا تم یقین کرو گی میرے یہ تین دن شدید ذہنی عذاب میں گزرے ہیں۔۔۔جمرود میں فضائی مظاہرہ تھا۔فضائیہ کے کمانڈر انچیف اور صدر مملکت بہ نفس نفیس اس مظاہرے کو دیکھنے تشریف لا رہے تھے۔میرا ڈائمنڈ فارمیشن لوپ میں حصہ تھا۔ارم یقین جانو جب فضا کی بلندیوں میں پہنچتا،ونڈ سکرین پر تمہارا اداس و مغموم چہرہ ابھر آتا اور میرے ہاتھ کانپ کانپ جاتے۔یہ احساس کہ تم مجھ سے ناراض ہو کر پشاور سے چلی گئی ہو۔مجھے بے قرار کر دیتا۔

ارم!۔۔۔وہ میرے دوست کی بیگم اور والدہ تھیں۔میرا ارادہ پکچر کے بعد ان سے تمہارا تعارف کرانے کا تھا۔۔۔یہ دل خوش کن احساس کہ تعارف کے وقت تمہارے غصیلے چہرے پر کتنی حسین مسکراہٹ پیدا ہو گی۔میرے لئے تقویت کا باعث تھا۔اور اسی لئے میں اطمینان سے فلم دیکھتا رہا۔۔۔ارم!۔۔۔یہ ضروری تو نہیں کہ انسان اپنے محسوسات

کوالفاظ کا جامہ ضرور پہنائیے۔۔۔ارم!۔۔۔جذبات کو زبان مل جائے تو ان کی دلکشی ماند پڑ جاتی ہے۔۔۔ان کا حُسن اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ دل کے نہاں خانوں میں چھپے ہیں۔۔۔"

"ثاقب میں ایک بار پھر کہوں گی کہ میرے جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہ کیجیے۔۔۔"ارم کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔۔۔

"ارم!۔۔۔مذاق کو اتنی گہرائی تک لے جانے کی کوشش مت کرو۔۔۔"ثاقب کے لہجے میں اداسی تھی۔

"آپ کا مذاق میرے ذہن کے لئے ناگ سے کم نہیں۔ایسا مذاق میں برداشت نہیں کر سکتی جو میرا ذہنی سکون لوٹ لے۔۔۔"یہ کہتے ہوئے وہ واپس جانے کو دروازے کی طرف بڑھی۔۔۔

"نہیں ارم!۔۔۔مجھے اپنی زیادتی پر افسوس ہے۔۔۔"ثاقب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔

"چھوڑیئے میرا ہاتھ،آپ کے نزدیک تو میرے جذبات کھلونا ہیں۔جنہیں جب دل چاہا توڑ دیا جاتا ہے۔اور جب جی چاہتا ہے جوڑ لیا جاتا ہے۔دل کے آبگینے بہت نازک ہوتے ہیں ثاقب!"

"ایسا مت سوچو ارم!۔۔۔"ثاقب کے لہجے میں تڑپ کے ساتھ ساتھ التجا تھی۔

"کیوں اور کیسے نہ سوچوں؟آپ کا برتاؤ آپ کا رویہ یہ سب کچھ سوچنے پر مجھے مجبور کرتا ہے۔۔۔"اس کا ہاتھ جھٹک کر وہ باہر نکل گیا۔

دل و دماغ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔۔۔

" کہاں گئے وہ تمہارے دعوے، کہاں گئی وہ تمہاری خودداری؟ تمہاری اکڑی گردن اس کے آگے اتنی جلدی کیوں جھک گئی؟۔۔۔۔"

ذہنی کھچاؤ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ رہا تھا بے اختیار اس نے سنگِ مرمر کی بنچ پر پیر رکھ دیا۔۔۔۔مگر کھچاؤ کم نہ ہوا وہ اٹھی اور گھاس پر لیٹ گئی۔ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس بھی تپتے ہوئے وجود کو سکون نہ پہنچا سکی۔

اچانک فضا میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔۔۔۔تڑپ کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔جیٹ فائیٹر رعد کی طرح کڑکتا آسمان کی وسعتوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

"جیٹ فائیٹر۔۔۔۔۔"اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔

ثاقب فلائنگ سوٹ میں ملبوس اُسے یاد آیا۔

یہ جہاز ثاقب کا تھا۔۔۔۔ثاقب کا۔۔۔۔ثاقب کا۔۔۔۔وہ دیوانوں کی طرح فضا کو گھورتے ہوئے چلانے لگی۔

اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوگئی تھی۔خوف کے بھیانک سائے دل کی دنیا میں رینگنے لگے تھے۔

وہ جیٹ فائیٹر لے کر آیا تھا۔۔۔۔کس امید پر آیا تھا؟اور کس حالت میں واپس جارہا ہوگا۔

اس کی باتیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں گونجنے لگیں۔

"اف میرے خدایا!اس کا دماغی الجھاؤ اور ذہنی پریشانی کہیں۔۔۔۔!"اس سے زیادہ وہ کچھ نہ سوچ سکی۔

"خدایا!تو ہی نگہبان ہے،معبود!تو اس کا امین ہے۔"

وہ سرپٹ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔۔۔۔راستے میں خادمہ ملی۔فوراً اس

نے ثاقب کے متعلق دریافت کیا اور یہ جاننے پر کہ وہ چلا گیا ہے۔اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں، اور جانتے ہوئے بھی کم ظرفی پر اتر آتی ہوں۔تنگ کرنا اور ستانا اس کی فطرت ہے اور فطرت کو بدلنا بہت مشکل ہے۔شوخ مسکراہٹ اس کی زندگی ہے تفکرات روزگار اور غم والام کے گھٹا ٹوپ اندھیرے بھی اس کی اس مسکراہٹ کو نہ چھین سکے۔یہ ان اندھیروں میں بھی جگمگائی جن کی تاریکی سے بڑی امی کا دم گھٹا جاتا تھا۔مجھے اس سے پیار ہے تو اس کی یہ عادت مجھے برداشت کرنا ہوگی۔"ذہنی دنیا میں گڑگڑاہٹ ہوئی اور وہ سسک اٹھی۔موجودہ اضطراب اور تڑپ نا قابل برداشت تھی۔

دل نے سوال اٹھایا"اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟۔۔۔۔"اور یہ ایسا کرب ناک احساس تھا جس میں اسے اپنے سارے خاندان کی امیدیں ڈوبتی نظر آئیں۔۔۔۔

وہ پائلٹ ہے پائلٹ۔۔۔۔جس کی زندگی کے ایک لمحے کی خبر نہیں۔جس کی زندگی خطرات کی آغوش میں گزرتی ہے۔ذہنی تفکر ایک ہواباز کے لئے خطرے کا باعث ہے۔شدید خطرے کا۔

اسی وقت وہ ڈرائینگ روم کی طرف بھاگی۔پشاور کے لئے کال بک کرائی۔اس دوران اس نے جانے کتنی دعائیں مانگ ڈالیں۔

فون پر جب اس نے ثاقب کی آواز سنی تو سسکیاں بھرتی ہوئی آواز میں اس نے معافی مانگی۔

"ارم!۔۔۔۔ثاقب تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔۔۔۔"

وہ آج کل رفعت اور سہیل کے ساتھ پشاور آئی ہوئی تھی۔پچھلے چند مہینوں سے ثاقب، رفعت اور عصمہ کو پشاور آنے کے لئے لکھ رہا تھا۔۔۔۔عصمہ تو آ نہ سکیں لیکن ارم گرما کی تعطیلات ہوتے ہی رفعت اور سہیل کے ساتھ پشاور پہنچ گئی۔

اور دونوں کے پھر وہی ڈھنگ تھے۔ایک پل میں لڑائی۔ایک پل میں صلح۔

اس دن اس نے کس محنت سے شامی کباب تیار کئے۔۔۔۔رفعت،مسز بخاری(ثاقب کے دوست کی بیگم) کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔دو بجے ثاقب ڈیوٹی سے آیا۔۔۔۔میز پر شامی کباب دیکھےتو لپک کر آیا اور جلدی جلدی کباب اٹھا کر کھانے لگا۔

"ارم!یہ تم نے تیار کئے ہوں گے؟۔۔۔۔"اس نے ارم کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھااور جواب اثبات میں پا کر بولا۔

"ہوں!۔۔۔۔تبھی نمک کا استعمال اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ کوئی یہی سمجھے نمک کی ساری کانیں جیسے میری زرخرید ہیں۔"

"کچھ اتنا زیادہ تو نہیں۔۔۔۔"

"یعنی کچھ ہے۔۔۔۔"ثاقب نے شرارت سے اُسے گھورا۔

"بھئی فیشن کرنے اور بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے میں تو آج کل کی لڑکیوں کا جواب نہیں۔۔۔۔اور بد قسمتی سے اگر کہیں کھانا پکانا پڑ جائے تو سبحان اللہ،مرچیں تیز،نمک تیز،مانو جیسے شوہر کریانہ مرچنٹ ہوں۔"

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔۔۔۔؟"ارم جھلائی۔

"رخ روشن پر شکنیں کیوں نمودار ہو گئیں؟حقیقت تلخ ہوتی ہے نا۔۔۔بد قسمتی سے اگر کوئی تمہاری باتونی صنف سے کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ مستقبل میں آپ کا کیا پروگرام ہے۔۔۔تو بس اللہ دے اور بندہ لے،اب جو پروگرام سنانے پر آئیں گےتو سانس تک لینا بھول جائیں گی۔۔۔۔ڈاکٹر بنیں گی۔۔۔۔قوم کی خدمت کریں گی۔۔۔۔غریبوں کا علاج ہمارے اسپتال میں مفت ہوگا۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ!!"

"ثاقب!۔۔۔آپ باز نہیں آئیں گے؟۔۔۔"ارم کا غصہ سے برا حال تھا۔

لیکن وہ بے نیازی سے شامی کباب کھانے اور اس پر چوٹیں کرنے میں مصروف تھا۔اس نے اب دونوں ہاتھ میز پر رکھ دیئے اور چہرہ ان پر ٹکاتے ہوئے اسی انداز میں بولا۔

"ہوں!۔۔۔تو غریبوں کا علاج مفت ہوگا۔۔۔لیکن کبھی ان غریبوں کے بارے میں بھی سوچا ہے۔جو تمہارے پلے بندھیں گے۔۔۔۔بدمزہ کھانے کھا کھا کر نہ ان کا شمار زندوں میں ہوگا، نہ مُردوں میں۔۔۔۔"

وہ بپھر ہی تو اٹھی۔

"اب اگر آپ ایک لفظ بھی بولے تو۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور اس سے پہلے کہ جملہ مکمل ہوتا ثاقب خاموش ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مسکراتے ہوئے گنگنایا۔۔۔۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں

" بھئی یوں میری زبان بند کر دینے سے حقیقت چھپ تو نہیں سکتی۔۔۔۔ذرا اپنی طرف ہی دیکھ لو۔کیا پکانا آتا ہے تمہیں؟تمہارا میاں تو اپنی اور تمہاری،دونوں کی جان کو روئے گا۔زبان ماشاءاللہ تمہاری خاصی تیز ہے اور ستم بالائے ستم ڈاکٹری پڑھی رہی ہیں جناب!اس غریب کا تو خاتمہ بالخیر سمجھو۔۔۔۔"

مارے غصے کے پاؤں پٹختے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اسی وقت رفعت بھی گھر آ گئیں۔ثاقب کو انہوں نے ڈانٹا۔۔۔۔اور روٹھی ہوئی ارم کو بمشکل گھسیٹ کر کھانے کی میز پر لائیں۔

شام کو چائے پر ان کے قہقہے پھر اسی طرح فضا میں گونج رہے تھے۔

باب نمبر:۳۵

ٹارچ کی روشنی میں دو روشن آنکھوں نے ۱۴۴ار A۶۷ نمبر کو دیکھا۔ڈرائیور کو رُک جانے کے لئے کہا۔جیپ رک گئی۔لمبا تڑنگا ایک آدمی اترا اور کوٹھی میں داخل ہوا۔برآمدے کی مدہم مدہم روشنی میں ایک لمحے کے لئے اس کی نگاہیں کال بیل کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکیں۔۔۔۔اور اگلے ہی لمحے وہ کال بیل پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ایک منٹ کافی تھا۔اس نے اپنا ہاتھ اٹھالیا اور منتظر نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

داہنے ہاتھ کا دروازہ کھلا۔آنکھوں میں کچی نیند کی سرخی لئے ثاقب شب خوابی کے لباس میں نمودار ہوا۔اجنبی نے فوجی قواعد کے مطابق سلیوٹ کیا۔اور مودبانہ انداز میں کاغذات اس کی جانب بڑھا دیئے۔

مدہم مدہم روشنی میں اس نے پڑھا اور سارجنٹ سے انتظار کرنے کا کہتا ہوا کمرے میں آگیا۔

اس کے چہرے پر غیر معمولی جوش اور خوشی کا دلفریب سا امتزاج نظر آ رہا

تھا۔۔۔۔اس وقت کا وہ ہمیشہ سے متمنی تھا۔

کشمیر میں جنگ آزادی شروع ہو چکی تھی۔یکم ستمبر کو پاکستان اور آزاد کشمیر کی افواج مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو چکی تھیں۔۔۔۔افواج کی پیش قدمی تیزی سے جاری تھی۔

اوران مجاہدین صف شکن کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے بھارت نے ہوائی جہاز فضا میں جھونک کر فضائی لڑائی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔۔۔۔راستہ صاف ہو چکا تھا۔فائیٹرز سکویڈرن تیار تھے۔اوران کے ہوابازوں کو ہر وقت تیار رہنے کے احکامات دیئے جا چکے تھے۔

یہ پانچ ستمبر کی شب تھی جب ثاقب کو اوپریشن روم میں فوری طور پر حاضر ہونے کے لئے بلایا گیا۔

پانچ منٹ میں وہ تیار تھا۔۔۔۔پہلے اس نے سوچا کہ وہ مختصر سا خط لکھ کر چھوڑ جائے۔۔۔۔لیکن پھر کتنے ہی خیال دل و دماغ میں آئے۔وطن کی آبرو اور سالمیت کے تحفظ کا وقت آ گیا تھا۔ملک وقوم کی محبت متقاضی تھی کہ وہ اپنے وطن کی حفاظت کا پورا پورا حق ادا کرے۔

اس کےقدم ملحقہ کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔۔خواب گاہ کی مدہم روشنی میں پہلی نظر ارم پر پڑی۔

وہ رک گیا۔۔۔۔

نگاہوں میں شوق کی دنیا لئے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

کیا وہ اسے جگا دے؟۔۔۔۔اور جب وہ نیند سے مخمور نگاہیں کھول کر اسے دیکھے گی۔تب وہ چپکے سے گنگناتا ہوا ایک پیغام اسے دے ڈالے گا۔

شفق اس کے چہرے پر پھیل جائے گی۔رنگین مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں

تڑپنے لگی تھی۔

لیکن وہ اسے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیکھتا رہا۔۔۔۔بیدار کرنا چاہا۔۔۔مگر نہ کر سکا۔۔۔۔یونہی خیال آیا کہ ممکن ہے وہ پریشان ہو جائے۔۔۔۔

نگاہیں اٹھیں اور دوسرے پلنگ پر جا رکیں۔اس کا دل بھر آیا۔

ان کے باوقار چہرے پر پاکیزگی کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔۔۔اس کی ماں۔۔۔عظمت و ایثار کی درخشندہ،روشن مثال،مصائب کو پاؤں تلے روندنے والی۔۔۔۔اور تقدیس کی حفاظت کے لئے دنیا سے ٹکرا جانے والی شخصیت۔۔۔۔۔

جنہیں جیون میں خوشیاں ملی بھی تو چند لمحوں کے لئے لیکن غم اتنے زیادہ کہ انہیں سہتے سہتے۔۔۔۔روح بوجھل ہو گئی۔

وہ جھکا اور ان کے پاؤں کے تلوؤں سے گہری عقیدت کے تحت آنکھیں لگا دیں۔۔۔۔اس پر بے خودی سی طاری تھی۔گھڑی کی ٹِک ٹِک اسے جذباتی دنیا سے گھسیٹ کر باہر لے آئی۔کلائی پر نگاہ ڈالی۔وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔۔۔۔وہ اٹھا۔۔۔۔ان کی پیشانی پر آہستگی سے ہاتھ رکھ کر انہیں پکارا۔۔۔۔

محبت بھرے دل کی اس پکار نے رفعت کو فوراً نیند سے بیدار کر دیا۔۔۔۔آنکھیں کھولیں تو بیٹے کو وردی میں ملبوس خود پر جھکے پایا۔

آنکھیں پھیل گئیں۔۔۔۔وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولیں۔۔۔۔

"خیریت ہے نا بیٹے؟۔۔۔۔"

"جی ہاں امی جان!۔۔۔۔آیئے باہر چلیں۔۔۔۔"

دل دھڑک اٹھا۔قدموں میں لرزش محسوس ہوئی۔تصور میں آگ اور خون کے

دریا ابھرے۔

پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔۔۔۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وزنی پتھروں کے نیچے دب گئی ہوں۔

مدہم مدہم روشنی میں ماں بیٹا ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

شگفتہ مسکراہٹ سے ثاقب کا چہرہ منور تھا۔ماں کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

"میں نے آپ کو تکلیف دی ہے امی جان!۔۔۔لیکن ممکن ہے آج رات مجھے کہیں بھیج دیا جائے۔"

"ثاقب!۔۔۔۔"ان کے ممتا بھرے دل نے پکارا۔۔۔۔آنکھوں میں آنسو امنڈے۔رفعت ان آنسوؤں کو پی جاؤ۔۔۔۔انہیں بہنے سے روک دو۔۔۔ان کے ضمیر نے انہیں آواز دی۔۔۔۔

"تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ سرزمین کشمیر مظلوم و مجبور اور بے بس کشمیری مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن رہی ہے۔۔۔۔خون مسلم اتنا ارزاں تو نہیں رفعت! کہ اسے یوں بے دردی سے بہایا جائے۔آگ اور خون کے طوفان انہیں ملیا میٹ کر رہے ہیں۔۔۔۔اور تم بیٹے کو محاذ پر بھیجتے ہوئے رو رہی ہو۔۔۔۔تمہارے جذبے کیا قرون اولی کی ان مسلمان ماؤں سے کم ہیں جو بیٹوں کے سینوں پر ہتھیار سجا کر انہیں محاذ پر رخصت کرتی تھیں۔۔۔۔کیا انہیں جگر گوشوں سے محبت نہ تھی۔کیا ان کے سینے ممتا کے جذبات و احساسات سے خالی تھے؟ نہیں رفعت!۔۔۔۔تمہاری طرح وہ بھی مائیں تھیں۔ان کے سینوں میں بھی دل دھڑکتے تھے"ان دھڑکنوں میں بھی جگر گوشوں کی محبت سمٹی ہوئی تھی۔وقت نے۔۔۔۔نازک لمحات نے۔۔۔۔تم جیسی باعزم اور مسلمان خاتون کو چیلنج کیا ہے۔۔۔۔کیا تم اس چیلنج کا

جواب نہ دو گی؟ مسکراؤ تا کہ دنیا یہ جان لے کہ مسلمان ماؤں کے جذبے آج بھی زندہ ہیں۔۔۔" پلکوں پر تھرتھراتے آنسو رخساروں پر بہہ گئے۔

بازو پھیلے۔۔۔۔اور ان بازوؤں کے ہالے میں ثاقب سمٹ آیا۔۔۔۔دیوانہ وار اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ثاقب!۔۔۔تم میرے پاس خدا کی مقدس امانت ہو۔۔۔۔اور یہ امانت میں اسی کے سپرد کرتی ہوں۔۔۔۔" وہ رک گئیں۔۔۔۔شدت احساس سے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔۔۔جذبات کا ایک طوفان تھا جو سینے میں مچل رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ان کے سامنے ایک حسین اور باعزم سراپا آ کھڑا ہوا۔ "رفعت!۔۔۔۔ہم اس قوم کے افراد ہیں جو سروں پر کفن باندھ کر میدان عمل میں اتری تھی۔۔۔جن کا ہلالی پرچم سندھ، سپین اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں لہرایا تھا۔۔۔۔رفی! زمانہ اپنی تاریخ پھر دہرائے گا۔۔۔"

"ہمایوں! تم اسی وقت کے منتظر تھے۔مسلمان میدان کارزار میں کود پڑے ہیں۔۔۔۔اور معرکہ حق و باطل کا میدان سرگرم ہے۔۔۔۔" انہوں نے سسکی سی بھری۔

"جاؤ ثاقب!۔۔۔۔تم قوم کا بیش قیمت سرمایہ ہو اور میں یہ سرمایہ قوم کو بخشتی ہوں۔۔۔۔جاؤ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

چہرے پر عزم کی روشنی اور ایثار کے دیئے جلائے ثاقب نے ماں کو دیکھا۔۔۔۔ان کے آنسو پونچھے۔۔۔۔جھک کر ہاتھوں پر بوسہ دیا۔۔۔۔اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

رفعت اسی جگہ کھڑی تھیں۔۔۔۔کچھ احساس نہ تھا، تصور کہاں کہاں اڑائے لے

جا رہا تھا۔کتنے ڈراؤنے منظر نگاہوں کے سامنے لا رہا تھا۔

"میں اس کی رضا پر راضی ہوں ۔۔۔۔راضی ہوں ۔۔۔۔راضی ہوں "خود سے کہتے ہوئے انہوں نے سر جھٹک دیا۔

وضو کیا اور خدا کے حضور میں جھک گئیں ۔

اشک بہتے رہے اور ہونٹوں سے دعائیں نکلتی رہیں ۔

صبح ارم کی آنکھ کھلی ۔۔۔۔رفعت کو قرآن مجید کی تلاوت کرتے دیکھا۔صبح بخیر کہا تو ان کے اداسی میں ڈوبے لب و لہجے اور چہرے کو دیکھتے ہی اسے اپنی رگوں میں رواں خون منجمد ہوتا محسوس ہوا۔

ایک ہی جست میں وہ ان کے پاس تھی ۔

اور جب اسے ثاقب کے متعلق معلوم ہوا تو یوں لگا جیسے نازک دل پھٹ جائے گا۔۔۔اس کے ٹکڑے فضا میں بکھر جائیں گے ۔

حسین آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکے اور لڑھک کر دامن میں گر گئے ۔وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی ۔آنسوؤں کی دھند میں اسے شعلوں کے بادل اڑتے دکھائی دے رہے تھے ۔توپوں کی گھن گرج کانوں میں گونج رہی تھی ۔انسانوں کے پرخچے اڑتے نظر آ رہے تھے۔

اس کا سارا وجود کانپ اٹھا۔آنکھوں میں خوف و ہراس کے سائے لہرائے ۔

"اف بڑی امی!۔۔۔" کہتے ہوئے اس نے اپنا سر ان کے شانے پر ٹکا دیا۔۔۔آنسوؤں کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلا ۔اس کی روح غم کے بوجھ سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی ۔۔۔۔دل درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔

"دعا کرو بیٹے!۔۔۔وہ ہمارے پاس آزادی کی حسین سحر کا پیامبر بن کر

آئے۔۔۔۔اٹھو نماز پڑھو۔۔۔۔"

گیارہ بجے ریڈیو کھولا۔

ایک گرجدار للکار۔ باعزم گونجتی آواز سنائی دی۔طوفان پھٹ پڑا تھا۔

صدرِ مملکت کی گرجتی ہوئی آواز مُلک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر رہی تھی۔

"عیار دشمن نے پاکستان کی سرحدوں پر رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا تھا۔اس سے۔۔۔۔اس لمحے وہ ہر چیز بھول گئی۔ہر چیز۔۔۔۔حتیٰ کہ خود کو بھی فراموش کر گئی۔فقط ایک ہی چیز یاد تھی۔

لاہور پر حملہ ہو گیا ہے۔۔۔۔پاکستان پر حملہ ہو گیا ہے۔۔۔۔وطن عزیز پر حملہ ہو گیا ہے۔۔۔۔وطن کی سالمیت کو خطرہ ہے آبروئے وطن کو خطرہ ہے۔۔۔پاکستان کا وقار خطرے میں ہے۔

"خدایا!۔۔۔۔میرے وطن کی آبرو کا تو محافظ ہے۔اس کی سالمیت کا تو نگہبان ہے۔یہ مُلک جسے ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔۔۔۔معبودِ حقیقی اس کی حفاظت تیرے ہاتھ میں ہے۔

"بڑی امی!۔۔۔لاہور چلیئے۔۔۔۔"وہ تڑپ رہی تھی۔

اور اسی شام وہ لاہور کے لئے روانہ ہو گئیں۔

با عزم اور دلیر لوگوں کا لاہور زندہ تھا۔۔۔۔شہر میں زندگی تھی۔۔۔۔جوش تھا۔۔۔۔ولولہ تھا۔۔۔۔امنگیں تازہ تھیں۔۔۔۔حوصلے جوان تھے۔

توپیں آگ اگل رہی تھیں۔۔۔جہاز بجلی کی طرح کڑک رہے تھے۔سائرن بجتے۔۔۔۔گھر والے مورچوں میں بھاگتے لیکن وہ جہاں موجود ہوتی۔وہاں سے ہٹنے کی کوشش نہ کرتی۔

"نہیں۔میں کبھی مورچے میں نہیں جاؤں گی۔میرا شاہین فضاؤں میں برسرِ پیکار ہے۔وہ مُلک کی سلامتی کے لئے لڑ رہا ہے۔اس کی موجودگی میں دشمن کا کوئی جہاز کسی پاکستانی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

فضائیہ کے شاہینوں نے جنگ کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ہسپتال میں تیزی سے کام کرتے ہوئے جب اس کے کانوں میں کسی ترانے کی آواز گونجتی۔

تم فضا کا حُسن ہو
آسماں کا ناز ہو
تم دلوں میں پھیلتی
روشنی کا راز ہو

تو اس کے ہاتھوں میں تیزی آجاتی۔۔۔۔اس کا شاہین اپنی دلفریبیوں سے اس کے تصور میں فلائنگ سوٹ میں ملبوس ابھرتا۔ہونٹوں پر ترانے کے بول مچل اٹھتے۔نغمہ بدل جاتا، دھن بدل جاتی۔

میریا ڈھول سپاہیا
تینوں رب دیا رکھاں
جنہاں راہواں توں آویں
جنہاں راہواں توں جاویں

اور کبھی کبھی ایسے بھی اضطرابی لمحے آتے۔جب وہ پریشان ہو اٹھتی۔آسمان کی مغربی وسعتوں میں پھیلی لالی اسے لرزا جاتی۔

لالی۔۔۔۔جسے دیکھ کر اسے ہر سو خون بکھرا نظر آتا۔آرزوؤں اور امنگوں کا خون۔۔۔۔چاہتوں کا خون۔۔۔۔پیار کا خون۔۔۔۔

وہ سر کو ستون سے ٹکا دیتی۔ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھتی ۔۔۔ٹپ ٹپ آنسو گرتے اور وہ پکار اٹھتی ۔

"ثاقب!۔۔۔تم کہاں ہو۔۔۔کہاں ہو۔۔۔میری زندگی کے درخشاں ستارے!۔۔۔تم کہاں ہو؟۔۔۔"

اور مایوسی کے ان لمحات میں اس کے کانوں میں ہوا کے دوش پر لہراتے بول پڑتے ۔

آج مظلوم ظالم سے ٹکرائے گا

آج دشمن کا تختہ الٹ جائے گا

مایوسیاں پَل بھر میں کہیں دور بھاگ جاتیں ۔رگ و پے میں بجلیاں دوڑ جاتیں ۔۔۔جوش غضب سے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔

وہ رفعت کے کمرے میں داخل ہوتی ۔۔۔مقدس چہرے پر غایت درجہ سکون اور عظمت کے دیئے فروزاں دیکھتی تو سر جھٹک کر ہر خدشے کو دل و دماغ سے نکال پھینکتی ۔۔۔خبروں کا آخری بلیٹن سن کر اس نے ریڈیو بند کر دیا۔

آج وہ اپنے تمام زیور دفاعی فنڈ میں دے آئی تھی ۔اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے ۔شدت سے جی چاہ رہا تھا۔کاش وہ بھی محاذ پر چلی جائے ۔سرفروشی سے لڑے اور شہید ہو جائے ۔

اچانک کھڑکی کے راستے آتے چاند کی مدہم مدہم روشنی میں اس نے کسی سیاہ ہیولے کو دروازے میں کھڑے دیکھا۔

" کون؟۔۔۔"وہ تیزی سے بول اٹھی ۔

"تمہارا ثاقب!"

"ثاقب!"

وہ کس تیزی سے اس کی طرف لپکی ۔۔۔۔اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر وہ کس والہانہ انداز میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔

تصور اڑا جا رہا تھا۔ثاقب کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے اس کے سامنے آ رہے تھے۔

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ارم! یہ آنسو کیسے؟۔۔۔۔"ثاقب نے آہستگی سے اس کے آنسو پونچھے۔

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"سرگودھا سے۔۔۔۔"

"محاذ کی کیا حالت ہے؟۔۔۔۔"

"دشمن ہر محاذ پر پسپا ہو چکا ہے۔۔۔۔"

"آپ بڑی امی اور ابو سے ملے ہیں۔۔۔۔؟"

"میں سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں ارم۔۔۔۔"

"ارم۔۔۔۔!"

کچھ دیر بعد پیار بھری بوجھل آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔۔۔۔بے خودی وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔۔دو حسین آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں تمہیں بہت تنگ کرتا رہا ہوں۔بہت ستاتا رہا ہوں۔کیا تم میری زیادتیوں کو معاف کر سکو گی؟"

دل میں درد کی ٹیس اٹھی، آنکھوں سے ڈھیروں آنسو بہہ نکلے۔

''ایسا مت کہو ثاقب!۔۔۔۔وہ دن میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ

ہیں۔۔۔۔مجھے تم پر فخر ہے۔۔۔۔فخر ہے۔"اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"ثاقب!۔۔۔۔"ارم بے اختیار اس کی طرف جھک گئی۔

''ایک بار صرف ایک بار کہہ دو ثاقب! کہ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔۔۔نفرت نہیں ہے۔۔۔۔"

"نفرت؟۔۔۔۔"

مضطرب ہو کر اس نے ارم کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔۔۔۔

"ان نازک ترین لمحات کی قسم جب کہ موت کے فاصلے سمٹ کر قریب تر آ گئے ہیں۔۔۔۔اور مجھے ایک لمحہ اور پل کی خبر نہیں۔۔۔۔میں خلوص دل سے تمہیں چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔۔"

وہ رک گیا۔۔۔۔اس کی روشن آنکھوں میں محبت و پیار کے ساغر بہہ رہے تھے۔۔۔۔دھیرے سے اس نے ارم کا سر اپنی طرف کیا۔۔۔۔اور اس کی حسین پیشانی پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے۔

''یقین کرنا ارم!۔۔۔۔ثاقب نے تمہیں خود سے بڑھ کر پیار کیا ہے۔۔۔۔"اس کی آواز میں سوز تھا۔

بے اختیار اس کا سر ثاقب کے سینے سے جا لگا۔بازو پھیل کر سمٹ گئے ان سمٹے ہوئے بازوؤں میں ارم سما گئی۔

اس کے گھنے بالوں پر سر رکھے ثاقب ہر چیز بھول گیا تھا۔کتنی ٹھنڈک تھی؟ کیسا سکون تھا؟ کائنات کی ہر شے رنگین ہو گئی تھی۔ہواؤں میں پیار کی مہک رچ گئی تھی۔

اور دو پیار بھرے دل سرور کے انوکھے جہان میں پہنچ گئے تھے۔

"وعدہ کرو ارم!۔۔۔۔کہ تم کبھی ان زاویوں سے نہ سوچو گی۔۔۔۔"شدت

جذبات سے اس کی آواز بوجھل سی تھی۔

مغموم مغموم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ارم نے اپنا ہاتھ ثاقب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"شکریہ!۔۔۔۔" ثاقب جھکا اور اپنے ہونٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔۔۔۔

" آؤ چلیں۔۔۔۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔۔۔۔

ایک گھنٹہ بعد وہ چلا گیا۔۔۔۔جس سکون سے رفعت نے اسے رخصت کیا اس کی کسر ارم کے آنسوؤں نے پوری کر دی۔

ثاقب کو گئے دو دن ہو رہے تھے۔

دو دن۔۔۔۔جن کا ایک ایک لمحہ ایک ایک منٹ دشمن کے لئے موت ثابت ہو رہا تھا۔

وارڈ میں راؤنڈ ختم کرتے ہی وہ ڈیوٹی روم کی طرف بھاگی۔ٹرانسسٹر کھولا۔

صدرِ مملکت نے فضائیہ کے جن جوانوں کو بہترین کارکردگی پر فوری اعزازات دیئے تھے۔ان میں اُس کا نام تھا۔

"فلائٹ لیفٹنٹ ثاقب ہمایوں۔۔۔۔ستارہ جرات۔لاپتہ ہے۔"

وہ تیوراکر گری۔تہمینہ اور رضیہ گل اس کے ساتھ ہی خبریں سن رہی تھیں۔۔۔۔ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ثاقب سے ان کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔لیکن وہ ان سب کی متاع عزیز تھی۔۔۔۔اس کے ساتھ ان کے قلبی و روحانی تعلقات تھے۔۔۔۔کیسے نہ روتیں۔

وطن کا ایک جانباز، جیالا اور نڈر ہوا باز شہید ہو گیا تھا۔

ثاقب شہید ہو گیا تھا۔

اور وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکی تھی ۔۔۔الٹی سیدھی بہکی بہکی باتیں ۔

کتنے ہی بے سکون دن اور بے خواب راتیں بیت گئیں ۔لیکن جس کسک اور تڑپ سے ارم آشنا ہو چکی تھی ۔اس کی شدت میں کمی نہ ہوئی ۔

اللہ! یہ خونی جنگ، یہ تباہ کن جنگ، کتنی بربادیاں اور ویرانیاں اپنے دامن میں سمیٹ لائی ہے ۔جنگ کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں نے کسی کے پیار کو جلا ڈالا ہے ۔۔۔ان کوندتی بجلیوں نے ہرے بھرے آشیانے راکھ کر دیئے ہیں ۔۔۔کیوں ہوتی ہیں یہ جنگیں؟ ۔۔۔"وہ تڑپ اٹھی ۔۔۔

آنکھیں کھولیں ۔۔۔حواس قدرے ٹھیک تھے ۔۔۔اپنے سامنے اداسی میں ڈوبے ایک غمگین چہرے کو دیکھا ۔۔۔اس کی کھلی آنکھیں دیکھ کر دہ غمزدہ آنکھیں اس پر جھک گئیں وہ آنکھیں جن میں تاریک پرچھائیاں رینگ رہی تھیں ۔۔۔اداسی کے گہرے ہالے میں لپٹا ہوا چہرہ پُرسکون تھا ۔۔فریاد سے عاری لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے ۔۔۔ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔

"میرا غم بڑی امی کے غم سے زیادہ تو نہیں ۔۔۔"

''ارم! ۔۔۔''اس نے اپنی پیشانی پر محبت بھرے ہونٹوں کا لمس محسوس کیا ۔۔۔

درد و سوز میں ڈوبی ہوئی ایک آواز اپنے کانوں کے قریب ہی محسوس کی ۔۔۔۔

"ہمیں ثاقب کی سرفرازی پر ماتم ۔۔۔۔نہیں کرنا چاہیے بیٹا! آزاد قوموں کے جیالے افراد، اپنے گرم ہو سے ہی عروس وطن کی مانگ میں سیندور بھرتے ہیں ۔۔۔

تم جانتی ہو نا ۔۔۔سیندور دلہن کے حُسن اور رنگ روپ کو نکھار بخشتا ہے ۔

سیندور نہ ہو تو دلہن لٹی لٹی، اجڑی اجڑی معلوم ہوتی ہے ۔

"ارم بیٹے!۔۔۔قوموں کا حُسن قربانیاں دیئے بغیر نہیں نکھرتا۔۔۔۔ثاقب نے وقت کی پکار کا جواب دیا ہے۔بیٹے!۔۔۔۔وہ خود قربان ہو گیا ہے تو کیا؟۔۔۔اس نے وطن کی ہزاروں دلہنوں کے سہاگ کو اجڑنے سے تو بچا لیا ہے۔۔۔۔باغ حیات کا شگفتہ پھول پوری طرح کھلنے سے قبل ہی مسلا گیا تو کیا؟۔۔۔۔ہزاروں غنچے تو مسلے جانے سے بچ گئے ہیں۔۔۔۔

خون اور آگ کے طوفان میں وہ اگر جل گیا تو کیا۔۔۔۔اس نے ملک کو آگ اور خون کی ہولی کھیلنے سے تو بچا لیا ہے۔دشمن اس کی جانبازی اور سرفروشی دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔۔وہ کوندتی بجلی اور دہکتے شرارے کی طرح لپکا۔۔۔۔اور دشمن کو جلا کر خاکستر کر گیا۔۔۔۔

وہ ثاقب تھا بیٹے!۔۔۔۔اور ثاقب کی طرح چمک کر اپنے جاوداں نقوش چھوڑ گیا ہے۔۔۔۔آنکھوں سے آنسو پونچھ دو ارم!۔۔۔۔شہید کو رونا گناہ ہے۔۔۔۔"

"بڑی امی۔۔۔۔دلخراش چیخ اس کے حلق سے نکلی اور تڑپ کر اس نے سر ان کے شانے پر رکھ دیا۔

"میں آپ کا ثاقب ہوں!۔۔۔۔میں ڈاکٹر بن کر پاک فضائیہ کی خدمت کروں گی۔۔۔اور اس شمع کی لو کو مدہم نہ ہونے دوں گی جو ثاقب نے اپنے خون جگر سے فروزاں کی ہے۔۔۔۔"

"میرے چاند!۔۔۔۔۔۔۔۔۔"رفعت کے ہونٹ اس کی پیشانی پر ثبت ہو گئے۔

اور فضاؤں میں نغمہ گونج اٹھا۔۔۔۔۔

"رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو!"